سود

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب: سود

مصنف: مولانا محمد یوسف اصلاحی

اشاعت: ایڈیشن　　　تعداد

ا۔۲۲۔ ستمبر ۱۹۹۹ء (پیپر بیک)　　۴۴۷۰۰

۲۳۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء　　۳۲۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای' شاہ عالم مارکیٹ' لاہور (پاکستان)

فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674

شوروم　منصورہ ملتان روڈ' لاہور۔ فون نمبر: 448022

10- چیٹر جی روڈ' اردو بازار' لاہور فون نمبر: 7248676

10۔بی شہزاد پلازہ' کالج روڈ بالمقابل نیو اردو بازار' راولپنڈی

www.Islamicpak.com

مطبع: میٹرو پرنٹرز' لاہور　　**قیمت اعلیٰ ایڈیشن /120 روپے**

قیمت: -/90 روپے

بینک کا سود ۲۵۴

فے کا نہ لینا وطنی جرم بھی ہے ۲۵۷

اسلامی حکومتوں اور ریاستوں کا حکم ۲۶۰

مولانا کا دوسرا مضمون

تنقید از مصنف ۲۸۱

مولانا کے دلائل کا خلاصہ ۲۸۱

دلائل مذکورہ پر مجمل تبصرہ ۲۸۳

کیا عقود فاسدہ صرف مسلمانوں کے درمیان ممنوع ہیں؟ ۲۸۹

دار الحرب کی بحث ۲۹۵

قانونِ اسلامی کے تین شعبے ۲۹۵

اعتقادی قانون ۲۹۶

دستوری قانون ۲۹۹

دار الحرب اور دار الکفر کا اصطلاحی فرق ۳۱۲

تعلقات خارجیہ کا قانون ۳۱۳

کفار کی اقسام ۳۱۵

(۱) باجگذار ۳۱۵

(۲) معاہدین ۳۱۷

(۳) اہل غدر ۳۱۸

(۴) غیر معاہدین ۳۲۰

(۵) محاربین ۳۲۳

اموال حربیہ کے مدارج و احکام ۳۲۳

غنیمت ۳۲۳

فے ۳۲۵

یہ محض ایک رخصت ہے اور ایسی رخصت ہے جس سے اولوالعزم مسلمانوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسلامی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کسی حال میں بھی حرام کی کمائی لینے پر آمادہ نہ ہو۔ خصوصاً کفار اور دشمنوں کے مقابلہ میں تو اس کو اپنے قومی اخلاق کی بلندی اور بھی زیادہ شان کے ساتھ ظاہر کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان کی لڑائی دراصل تیر و تفنگ کی نہیں اصول اور اخلاق کی لڑائی ہے۔ اس کا مقصد زر و زمین حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ دنیا میں اپنے اصول پھیلانا چاہتا ہے۔ اگر اس نے اپنے مکارم اخلاق ہی کو کھو دیا، اور خود ہی ان اصولوں کو قربان کر دیا جن کو پھیلانے کے لیے وہ کھڑا ہوا ہے، تو پھر دوسری قوموں پر اس کی فوقیت ہی کیا باقی رہی؟ کس چیز کی بنا پر اس کو دوسروں پر فتح حاصل ہو گی اور کس طاقت سے وہ دلوں اور روحوں کو مسخر کر سکے گا؟

دارالحرب کی بحث

اب ہمیں دوسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے فرق کی بنیاد پر سُود اور تمام عقود فاسدہ کے احکام میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اور اس بیان کی کیا اصلیت ہے کہ تمام غیر ذمّی کافر مباح الدم والاموال ہیں اس لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لے لینا جائز ہے؟ اور اس تجویز کے لیے شریعت میں کیا گنجائش ہے کہ جس ملک پر کسی معنی میں اصطلاح دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہو وہاں کے باشندوں پر دائماً وہ تمام احکام جاری ہونے چاہئیں جو دارالحرب سے تعلق رکھتے ہیں؟

قانونِ اسلامی کے تین شعبے

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ شریعت یعنی قانونِ اسلامی کے تین شعبے ہیں:-

(۱) اعتقادی قانون جو علی الاطلاق تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے،

(۲) دستوری قانون جس کا تعلق صرف سلطنتِ اسلامی سے ہے،

(۳) بین الاقوامی قانون، یا صحیح الفاظ میں تعلقات خارجیہ کا قانون جو مسلمانوں اور غیر قوموں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے۔

ہماری کتب فقہیہ میں ان قوانین کو الگ الگ مرتب نہیں کیا گیا اور نہ اُن کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے، لیکن قرآن و حدیث میں ایسے واضح اشارات موجود ہیں جن سے قدرتی طور پر اسلامی قوانین کا ارتقاء انہی الگ الگ راستوں پر ہُوا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جس فقیہ اعظم کی قانونی بصیرت اور فقیہانہ دقیقہ سنجی نے سب سے بڑھ کر ان اشارات کو سمجھا اور ان کی بنا پر قانون کے ان تینوں شعبوں کی حدود میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کیا، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس امتیاز کو ملحوظ رکھا وہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فقہائے اسلام میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ امام ابو یوسف جیسے بالغ النظر فقیہ کی رسائی بھی اس مقام تک نہ ہو سکی۔ امام اعظم کے کمال کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ۱۲ سو سال پہلے انہوں نے قرآن اور سُنّت سے استنباط کر کے دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے جو احکام مدوّن کیے تھے، آج تک دنیا کے قانونی افکار کا ارتقاء ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دراصل یہ ارتقاء ہُوا ہی اُن خطوط پر ہے جو ۱۲ صدی قبل کوفہ کے ایک پارچہ فروش نے کھینچ دیئے تھے۔ فقہ حنفی کی بہ نسبت جدید زمانہ کے قوانین میں بظاہر جو ترقی نظر آتی ہے وہ کسی حد تک تمدّنی احوال کے تغیّر کا، اور زیادہ تر بین الاقوامی معاہدات کا نتیجہ ہے۔ تاہم اصولی حیثیت سے جدید زمانہ کے قوانین بڑی حد تک حنفی فقہ کا چربہ ہیں اور ان کے مطالعہ سے حنفی فقہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اعتقادی قانون

اعتقادی قانون کے لحاظ سے دنیا دو ملّتوں پر منقسم ہے۔ اسلام اور کفر۔ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور تمام کفار دوسری قوم۔ اسلام کو ماننے والے سب کے سب اسلامی قومیت کے افراد ہیں اور اخوّت دینی کی بنا پر سب کو ایک دوسرے پر حقوق

حاصل ہیں فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ[1] (توبہ: ۱۱) مسلمان کی جان، اس کا مال اس کی عزت ہر چیز مسلمان کے لیے حرام ہے۔ ان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام[2] (حجۃ الوداع) اسلام کے جملہ احکام کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں بستا ہوا جو کچھ فرض کیا گیا ہے وہ سب کے لیے فرض ہے، جو کچھ حلال کیا گیا ہے سب کے حلال ہے، اور جو کچھ حرام ٹھہرایا گیا سب کے لیے حرام ہے۔ کیونکہ جملہ احکام کے مخاطب اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ہیں، کسی حال اور مقام کی قید اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں کفر ایک دوسری ملت ہے جس سے ہمارا اختلاف اصول اور اعتقاد اور قومیت[3] کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر اصلاً ہمارے اور ان کے درمیان جنگ قائم ہے، الآیہ کہ اس پر صلح یا معاہدہ یا ذمہ کی کوئی حالت عارض ہو جائے۔ پس اسلام اور کفر، اور مسلم اور کافر کے درمیان صلح اصل نہیں بلکہ جنگ اصل ہے اور صلح اس پر عارض ہوتی ہے۔ مگر یہ جنگ بالفعل نہیں بالقوہ ہے، عملی نہیں نظری اور اصولی ہے اس کے معنی

---

[1] پھر اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

[2] تم پر ایک دوسرے کے خون اور اموال اور عزتیں حرام ہیں۔

[3] واضح رہے کہ اس جگہ ہم "قومیت" کا لفظ نسلی اور وطنی قومیت کے معنی میں نہیں بلکہ تہذیبی قومیت کے معنی میں بول رہے ہیں، اور تہذیبی قومیت ہی پر اسلام تمدنی اور سیاسی قومیت کی عمارت اٹھاتا ہے۔ ایک ماں کے دو بیٹے نسلاً ایک قومیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک محلہ کے دو باشندے وطنی حیثیت سے ایک قومیت کے افراد ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہے تو ان کی تہذیبی قومیتیں الگ الگ ہو جائیں گی اور اصولی حیثیت سے وہ اختلاف رونما ہوگا جس پر بحث کر رہے ہیں۔

صرف یہ ہیں کہ جب تک ہماری اور اُن کی قومیت الگ ہے اور ہمارے اور ان کے اصول ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ہم میں اور ان میں حقیقی و دائمی صلح اور دوستی نہیں ہو سکتی۔ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔

(الممتحنہ ۴:)

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر حدیث میں بتمام و کمال بیان فرما دیا ہے:-

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنْ يَّسْتَقْبِلُوْا قِبْلَتَنَا وَاَنْ يَّاْكُلُوْا ذَبِيْحَتَنَا وَاَنْ يُّصَلُّوْا صَلٰوتَنَا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ حَرُمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ۔

(ابو داؤد باب علی ما یقاتل المشرکین)

مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ہمارے اوپر ان کے خون اور ان کے اموال حرام ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی حق کے بدلے میں ان کو لیا جائے۔ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں

لہ حضرت ابراہیمؑ نے کفار سے کہا کہ ہم تم سے اور ان معبودوں سے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے ہو، بے تعلق ہیں۔ ہم تم سے الگ ہو گئے اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور دشمنی ہو گئی۔ تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

اور ان پر فرائض وہی عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس اعتقادی قانون کی رُو سے اسلام اور کفر کے درمیان ابدی جنگ ہے، مگر یہ جنگ محض نظری (Thearetical) ہے۔ ہر کافر حربی (Enemy) ہے، مگر اس معنی میں کہ جب تک ہماری اور اس کی قومیت الگ ہے ہمارے اور اس کے درمیان بنائے نزاع قائم ہے۔ ہر دار الکفر محلِ حرب ہے۔ یا بالفاظِ دیگر حربیت کا کلی ارتفاع صرف اختلافِ قومیت ہی کے مٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔ اس قانون نے محض ایک نظریہ اور قاعدۂ اصلیہ واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے جس پر ان کی حکمتِ عملی کی بنا قائم ہے۔ باقی رہے حقوق و واجبات اور جنگ و صلح کے عملی مسائل تو ان کا اس قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دستوری اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔

دستوری قانون

دستوری قانون کی رُو سے اسلام دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک دار الاسلام۔ دوسرے دار الکفر۔ دار الاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کر سکیں[ل]۔ اس کے مقابلہ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی

[ل] دار الاسلام کی یہ تعریف تھوڑی سی تشریح کی محتاج ہے۔ درحقیقت صحیح معنوں میں دار الاسلام صرف وہ علاقہ ہے جہاں اسلام بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے حکمران ہو اور جہاں اسلامی قانون ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔ لیکن اگر کبھی ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ کسی ملک میں اقتدارِ حکومت ہو تو مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں مگر وہ اسلام کے بجائے کوئی اور نظامِ زندگی قائم کر دیں اور اسلامی قانون کے بجائے کوئی اور قانون نافذ کرنے لگیں، تو فقہائے اسلام ان سے مایوس ہو کر دفعتہً اس ملک کے "دار الکفر" ہونے کا اعلان کر دینا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے بالقوۃ "دار الاسلام" ہی قرار دیئے چلے جاتے ہیں (باقی حاشیہ ص ۳۰۰ پر)

قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تمام وہ ممالک جن میں انگریزی حکومت ہے انگریزی علاقہ کہلائیں گے، اور جو علاقے ان حدود سے باہر

(بقیہ حاشیہ ۲۹۹ سے) جب تک کہ وہ مسلمان خود اسلام سے اپنا برائے نام تعلق بھی منقطع نہ کر لیں۔ فقہاء کا یہ محتاط طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی کسی با اختیار حکومت کا اپنے اصول اور قوانین میں نامسلمان ہونا لامحالہ دو ہی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ پر مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ملک کے مسلمان باشندے تو بدستور اسلام ہی کے معتقد ہوں اور اسی کی پیروی میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں مگر کسی نہ کسی سبب سے ایک گمراہ طبقہ زمام کار پر قابض ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ملک کے باشندوں میں عام طور پر جہالت اور گمراہی پھیل گئی ہو اور ان کی اپنی پسند سے وہ ضال اور مضل طبقہ بر سر اقتدار آیا ہو جو غیر اسلامی طریقوں پر قومی معاملات چلا رہا ہو۔ پہلی صورت میں تو یہ عین متوقع ہے کہ عامۂ مسلمین کا اسلامی شعور آخر کار بیدار ہو گا اور وہ اس گروہ کے اقتدار کو اُلٹ پھینکیں گے جو اسلام کے گھر میں کفر کا کاروبار چلا رہا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس عارضی غلبۂ کفر کو دیکھ کر مایوس ہو جائیں اور جلد بازی سے کام لے کر اس گھر کو خود ہی کفر کا گھر قرار دے بیٹھیں۔ رہی دوسری صورت تو وہ بلاشبہ مایوسی کا مقام ہے، لیکن جس قوم نے جہالت اور گمراہی کے باوجود ابھی تک اسلام سے اپنا تعلق نہیں توڑا ہے اور جو اس قدر بگڑ جانے پر بھی اپنا مذہب ابھی تک اسلام ہی بتائے جا رہی ہے، اس کی طرف سے ہم بھی اتنے مایوس نہیں ہو سکتے کہ اصلی اور حقیقی اسلام کی طرف اس کی واپسی کی ساری امیدیں منقطع کر لیں۔ لہٰذا ہم اس کے گھر کو بھی دارالکفر نہیں کہیں گے بلکہ دارالاسلام ہی کہتے رہیں گے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عملاً اسلامی قانون کا تعلق صرف دارالاسلام سے ہے جو بالفعل دارالاسلام ہو۔ رہا وہ مدعیٔ ”دارالاسلام“، جس نے خود ہی اسلام سے اپنا قانونی تعلق توڑ رکھا ہو تو اسلام اس کے سیاسی نظام کو وہ دستوری حقوق دینے کے لیے تیار نہیں ہے جو اس نے صرف ”اسلامی حکومت“ کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔

ہوں گے ان کو علاقۂ غیر کہا جائے گا۔ اسلامی حکومت اسلام کے احکام کو صرف اُن لوگوں پر نافذ کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ عمل (Jurisdicion) میں رہتے ہوں۔ اسی طرح وہ صرف اُنہی اموال اور اعراض اور نفوس کی حفاظت کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ اختیار یا علاقۂ مقبوضہ (Territory) میں واقع ہوں۔ ان حدود کے باہر کسی چیز کی حفاظت کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے ہر وہ جان اور مال اور عزت "معصوم" (Protected) ہے جو دارالاسلام میں اسلامی حکومت کی حفاظت کے اندر واقع ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ اور ہر وہ جان اور مال اور عزت "غیر معصوم" ہے جو دارالکفر میں ہو اور جس کی محافظ اسلامی حکومت نہ ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی غیر معصوم ہونے کا مآل صرف اس قدر ہے کہ اگر اس کی جان و مال یا عزت پر کسی کا حملہ کیا جائے تو اسلامی حکومت اس پر کوئی مؤاخذہ کرے گی، کیونکہ یہ فعل اس کے حدودِ عمل سے باہر واقع ہوا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خدا کے نزدیک وہ فعل گناہ ہو یا نہ ہو اور خدا کے ہاں اس پر مواخذہ ہو یا نہ ہو۔ پس کسی چیز کا غیر معصوم ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ مباح بھی ہے، نہ اس کی عدمِ عصمت کو اس معنی میں لیا جا سکتا ہے کہ اُسے نقصان پہنچانا یا اس پر قبضہ کر لینا عنداللہ بھی جائز اور حلال ہے۔ اسی طرح دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے اگر کسی ایسے فعل کو جائز ٹھہرایا جائے جس کا ارتکاب دارالکفر میں کیا گیا ہو تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہو گا کہ اسلامی اسلامی حکومت کو اس سے کوئی تعرض نہیں، وہ اس پر کوئی سزا نہیں دے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس فعل حرام پر خدا کے ہاں بھی کوئی گرفت نہ ہو گی۔

یہاں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کے حدود الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اعتقادی قانون جس مسلمان کو بھائی کہتا ہے اور جس کی جان و مال کو حرام ٹھہراتا ہے وہ دستوری قانون کی نگاہ میں غیر معصوم ہے، اس لیے کہ وہ سلطنت اسلامی کے

حدودِ اختیار سے باہر رہتا ہے۔ اور جس کافر کو اعتقادی قانون دشمن قرار دیتا ہے دستوری قانون اسے معصوم ٹھہراتا ہے صرف اس بنا پر کہ وہ اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آ گیا ہے۔ جس فعل کو اعتقادی قانون سخت گناہ اور جرم ٹھہراتا ہے، دستوری قانون اس پر کوئی گرفت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے حدودِ عمل سے باہر ہوا ہے۔ دونوں میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ اعتقادی قانون کا تعلق آخرت سے ہے اور دستوری قانون کا تعلق صرف دنیا اور اس کے معاملات سے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے سوا تمام فقہا نے کم و بیش ان دونوں میں خلط ملط کیا ہے اور وہ ان کے حدود میں پوری طرح تمیز نہیں کر سکے ہیں۔

چند مثالوں سے ہم اس پیچیدہ مسئلہ کی توضیح کریں گے۔

(۱) فرض کیجیے کہ ایک مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں جاتا ہے اور وہاں سے کچھ مال چرا لاتا ہے۔ یہ فعل اعتقادی قانون اور بین الاقوامی قانون کی رُو سے حرام ہے کیونکہ اس شخص نے عہد شکنی کی ہے۔ لیکن دستوری قانون اس شخص کو اس مال کا جائز مالک قرار دیتا ہے اور اس سے کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔

(ہدایہ باب المستامن)

(۲) فرض کیجیے کہ دار الاسلام کی رعایا کا ایک شخص دار الحرب میں قید تھا۔ وہ وہاں قید سے چھوٹ گیا یا چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ وہاں خواہ چوری کرے، شراب پیئے، زنا کرے، سب کچھ دستوری قانون کی رو سے ناقابلِ مواخذہ ہے (بحر الرائق ج ۵ ص ۱۰۷) یعنی اسلامی حکومت اس پر نہ اس کا ہاتھ کاٹے گی، نہ حدِ زنا و شراب جاری کرے گی نہ قصاص لے گی۔ مگر اعتقادی قانون کی رُو سے وہ خدا کے ہاں گناہگار ہو گا۔

(۳) فرض کیجیے کہ ایک شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا اور وہاں سے ہجرت کر کے

لہ واضح رہے کہ بیرونی ممالک میں جا کر دار الاسلام کی رعایا کے جو لوگ جرائم (باقی صفحہ ۳۰۳ پر)

دارالاسلام میں نہیں آیا۔ اعتقادی قانون کی رُو سے وہ مسلمان کا بھائی ہو چکا ہے۔ اس کا خون اور مال حرام ہو چکا ہے۔ مگر دستوری قانون کی رُو سے وہ چونکہ اسلامی سلطنت کے حدودِ عمل سے باہر ہے اس لیے اس کی کوئی چیز معصوم نہیں۔ اس کی حیثیت وہی ہو گی جو دشمن سلطنت کی رعایا کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان دارالاسلام کے حدود سے باہر اس کو قتل کر دے تو اسلامی عدالت نہ اس پر قصاص لے گی نہ خوں بہا دلوائے گی ـــــ بطور خود وہ کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اس سے سُود لے یا اس کے مال پر کسی دوسرے ناجائز طریقہ سے قبضہ کر لے تو دستوری قانون کی رُو سے یہ ناقابلِ گرفت ہے کیونکہ اس کا مال غیر معصوم ہے۔ اس باب میں فقہا کی تصریحات نہایت معنی خیز ہیں:۔

وَاِذْ اَسْلَمَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْحَرْبِ فَقَتَلَهٗ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَبْلَ اَنْ يَّخْرُجَ اِلٰى دَارِالْاِسْلَامِ خَطَاءً فَعَلَيْهِ الْكَفَّارَةُ وَلَا دِيَةَ عَلَيْهِ وَفِي الْاِمْلَاءِ عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ لَاَنَّهٗ لَا كَفَّارَةَ عَلَيْهِ اَيْضًا لِاَنَّ وُجُوْبَهَا بِاِعْتِبَارِ تَقَوُّمِ الدَّمِ لَا بِاِعْتِبَارِ حُرْمَةِ الْقَتْلِ ....

و تقوم الدم يكون بالاحراز بدار الاسلام۔

(شرح السیر الکبیر مطبوعہ دائرۃ المعارف ج ۱۔ ص ۸۸)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۲ سے) اور بداخلاقیوں کا ارتکاب کریں ان سے دارالاسلام کی حکومت اس بات پر تو ضرور بازپرس کر سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے رویہ سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا سامان کیا، اور اس بنیاد پر بھی وہ ان سے مواخذہ کر سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے غلط طرزِ عمل سے اپنی ریاست کے لیے بین الاقوامی معاملات میں اُلجھنیں پیدا کیں۔ لیکن اُن پر نفس اُس جرم (مثلاً قتل یا چوری) کے بارے میں کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا جس کا ارتکاب انہوں نے دارالاسلام کے حدود سے باہر کیا ہو۔

اگر اہل حرب میں سے کوئی شخص مسلمان ہو چکا ہو اور قبل اس کے کہ وہ ہجرت کر کے دارالاسلام میں آئے، کسی مسلمان نے اسے بلا ارادہ قتل کر دیا تو اس پر کفارہ ہے مگر خوں بہا واجب نہیں۔ اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے املاء میں یہ مسئلہ منقول ہے کہ اس پر کفارہ بھی نہیں ہے کیونکہ کفارہ کا وجوب خون کے باقیمت ہو جانے کے اعتبار سے ہے نہ کہ حرمتِ قتل کے اعتبار سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خون صرف اس وقت باقیمت ہوتا ہے جب کہ وہ دارالاسلام کی حفاظت میں آچکا ہو۔

وَلَمَّا ثَبَتَ بِمَا قَدَّمْنَا أَنَّهُ لَاقِيْمَةَ لِدَمِ الْمُقِيْمِ فِي دَارِ الْحَرْبِ بَعْدَ إِسْلَامِهِ قَبْلَ الْهِجْرَةِ إِلَيْنَا..... اجروہ اصحابنا مجری الحربی فی إِسْقَاطِ الضَّمَانِ عَنْ مُتْلِفِ مَالِهِ...... وَأَنْ يَكُونَ مَالُهُ كَمَالِ الْحَرْبِيِّ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَلِذٰلِكَ أَجَازَ أَبُو حَنِيْفَةَ مُبَايَعَةَ الْحَرْبِيِّ مِن بَيْعِ الدِّرْهَمِ بِالدِّرْهَمَيْنِ فِي دَارِ الْحَرْبِ۔

(احکام القرآن الحنفی، ج ۲-ص ۲۹۷)

اور جب ہماری پچھلی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہجرت نہ کرے اور دارالحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔[1]

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان کسی اسلامی حکومت کی حفاظت میں نہیں ہے بلکہ اس کے حدود اختیار سے باہر رہتا ہے اس کا خون بجائے خود خواہ کتنی ہی بڑی قیمت رکھتا ہو، لیکن اسلامی حکومت کے لیے اس کی قانونی قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے کوئی گزند پہنچے تو اسلامی حکومت اس کی کوئی دادرسی نہیں کر سکتی۔ اسے کوئی قتل کر دے تو اسلامی حکومت پر اس کا قصاص یا خوں بہا دلوانے کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے مال یا آبرو سے کوئی بے جا (باقی حاشیہ ص ۳۰۵ پر)

...... تو اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ایسے مسلمان کی حیثیت حربی ہی کی قرار دی ہے یعنی اس کے مال کو تلف کرنے والے پر کوئی ضمان نہیں...... اس حیثیت سے اس کا مال گویا حربی کا مال ہے اور اس بنا پر ابو حنیفہ نے اس کے ساتھ بھی اسی طرح خرید و فروخت کرنا جائز ٹھیرایا ہے جس طرح حربی کے ساتھ جائز ہے۔ یعنی دارالحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا۔

وقال الحسن بن صالح اذا اسلم الحربی فاقام ببلادھم وھو یقدر علی الخروج فلیس بمسلم یحکم علی اھل الحرب فی مالہ ونفسہ۔ (احکام القرآن)

حسن بن صالح کا قول ہے کہ جب دارالحرب کا ایک باشندہ مسلمان ہونے کے بعد دارالحرب ہی میں رہا۔ درآنحالیکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا تھا تو اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں[1]۔ اس کی جان و مال کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۴ سے) تعرض کرے تو اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ اس ظلم کا تدارک کرے۔ مگر یہ سب کچھ قانونی حیثیت سے ہے۔ ورنہ اعتقادی طور پر تو مسلمان کی جان مال اور آبرو مسلمانوں کے لیے دنیا جہان سے زیادہ قیمتی ہے اور دارالاسلام کے مسلمانوں کی دینی حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دارالکفر کے مسلمانوں کی جتنی اخلاقی مدد کر سکتے ہیں۔

[1] موجودہ زمانہ میں اس حکم کے لیے "ہجرت کی قدرت رکھنے" کے ساتھ ایک شرط اور بھی لگانی ہوگی، اور وہ یہ کہ دارالاسلام نے مہاجرین کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے ہوں اور اسلامی حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا ہو کہ مطلقاً دارالحرب اور دارالکفر کے، یا کسی خاص دارالحرب اور دارالکفر کے مسلمان اس کی طرف سمٹ آئیں۔ اس صورت میں جو لوگ قدرت کے باوجود ہجرت نہ کریں گے ان کے ساتھ دارالاسلام کے مسلمان ہر حیثیت سے وہی معاملہ کریں گے جو اس دارالکفر یا دارالحرب کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ہوگا۔ (باقی صفحہ ۶ پر)

وہی حکم ہے جو اہلِ حرب کی جان و مال کا ہے

وَ إِذَا أَسْلَمَ الْحَرْبِيُّ فِي دَارِ الْحَرْبِ فَقَتَلَهُ مُسْلِمٌ عَمْدًا أَوْ خَطَأً وَلَهُ وَرَثَةٌ مُسْلِمُونَ هُنَاكَ فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ إِلَّا الْكَفَّارَةَ فِي الْخَطَاءِ۔ (ھدایہ کتاب السیر)

جب کوئی حربی دارالحرب میں مسلمان ہو چکا ہو اور کوئی مسلمان اسے عمداً یا خطأً قتل کر دے اور اس کے مسلمان ورثا بھی دارالحرب میں موجود ہوں تو اس پر کوئی قصاص یا دیت نہیں ہے۔ خطا کی صورت میں محض کفارہ ادا کر دے۔

وَحُكْمُ مَنْ أَسْلَمَ فِي دَارِ الْحَرْبِ وَلَمْ يُهَاجِرْ كَالْحَرْبِيِّ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ لِأَنَّ مَالَهُ غَيْرُ مَعْصُومٍ عِنْدَهُ۔

(بحر الرائق ج ۵ - ص ۱۴۷)

اور جو شخص دارالحرب میں مسلمان ہو اور ہجرت نہ کرے اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵ سے) اور جو لوگ صریح طور پر ہجرت سے معذور رہوں گے اگرچہ دستوری حیثیت سے ان کے حقوق کچھ بھی نہیں ہیں، تاہم ان کے ساتھ بالکل غیر مسلم کا سا معاملہ نہیں کیا جائے گا بلکہ فوج کے سپاہیوں اور دوسرے مسلمانوں کو ہدایات دے دی جائیں گی کہ جنگ میں ان کو بچانے کی جس حد تک کوشش ممکن ہو کریں، اور حالت صلح میں بھی ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نرمی و رعایت کا برتاؤ کرتے رہیں۔ لیکن جب کہ دارالاسلام کی حکومت کی طرف سے باہر کے مسلمانوں کے لیے نہ تو ہجرت کی دعوت ہو اور نہ اس نے ان کی آمد کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھا ہو، تو اس صورت حال میں بیرونی مسلمانوں پر حسن بن صالح کا یہ قول چسپاں نہیں ہوتا کہ ان میں سے جو ہجرت کی قدرت رکھتا ہو اور ہجرت نہ کرے "اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں ہے" البتہ دستوری قانون کا یہ اصول بہرحال اپنی جگہ اٹل ہے کہ جو مسلمان دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں اور اس کے حدودِ اقتدار سے باہر ہوں ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ذمہ داری دارالاسلام کی حکومت پر نہیں ہے۔

حیثیت ابو حنیفہ رح کے نزدیک حربی کی ہے کیوں کہ اس کا مال ان کی رائے میں غیر معصوم ہے۔

(۴) فرض کرو کہ ایک مسلمان امان لے کر دار الحرب میں گیا اور وہاں اس نے کسی حربی سے قرض لیا یا اس کا مال غصب کر لیا۔ پھر وہ دار الاسلام واپس آ گیا اور وہ حربی بھی دار الاسلام میں امان لے کر آیا۔ یہاں وہ حربی مستامن اس قرض یا اس مال مغصوبہ کے لیے دار الاسلام کی عدالت میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلامی عدالت اس کو ایک پیسہ واپس نہ دلائے گی۔ اسی طرح اگر دار الحرب میں میں حربی نے مسلمان کا قرض مار لیا ہو اس کا مال غصب کر لیا ہو، پھر وہ حربی امان لے کر دار الاسلام میں آ ئے تب بھی اسلامی عدالت اس حربی کے خلاف اس مسلمان کی کوئی دادرسی نہ کرے گی۔ (الجامع الصغیر لامام محمدؒ علی ہامش کتاب الخراج الام ابی یوسف ص ۷۵)

(۵) اگر باپ دار الاسلام میں ہو اور اس کی نابالغ اولاد دار الحرب میں ہو تو اس اولاد پر سے باپ کی ولایت ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مال کا مالک دار الاسلام میں ہو اور مال دار الحرب میں ہو تو مالک کی جان معصوم ہو گی مگر مال معصوم نہ ہو گا۔ (فتح القدیر ج ۴۔ ص ۳۵۵۔)

(۶) دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان امان لے کر دار الحرب میں چلے گئے اور وہاں ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اگر قاتل دار الاسلام میں واپس آئے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔

وإنّما لا يجب القصاص لأنّه لا يمكن استيفاؤه إلّا بمنعة ولا منعة دون الإمام وجماعة المسلمين ولم يوجد ذالك في دار الحرب۔ (ھدایہ۔ کتاب السیر)

اس پر قصاص اس لیے واجب نہیں کہ قصاص بغیر حفاظت (Protection) کے واجب نہیں آتا اور حفاظت بغیر امام اور جماعت

مسلمین کے نہیں ہوتی۔ اور یہ چیز دار الحرب میں موجود نہیں ہے۔

(۷) دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان دار الحرب میں قید تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ یا کوئی مسلمان امان لے کر دار الحرب گیا اور وہاں اس نے کسی مسلمان اسیر کو قتل کر دیا۔ دونوں صورتوں میں قاتل پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا۔ علامہ ابن ہمام نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ اور بھی زیادہ معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں:-

فَلَا شَیْئَ علی القَاتِلِ مِنْ اَحْکَامِ الدُّنْیَا اِلَّا الْکَفَّارَۃَ فِی الْخَطَاءِ عِنْدَ اَبِی حَنِیْفَۃَ وانما عَلَیْہِ عِقَابُ الاٰخِرَۃِ فِی الْعَمدِ..... لِاَنَّہٗ صَارَ بِالاَسرِ تَبعاً لھم...... وصار کالمسلم الذی لم یھاجر الینا فی سقوط عصمتہ الدنیویۃ۔

(فتح القدیر ج ۴ ص ۲۵۱)

ابو حنیفہ کے نزدیک قاتل پر احکام دنیا میں سے کچھ نہیں بجز اس کے کہ وہ خطا کی صورت میں کفارہ ادا کر دے۔ رہا قتل عمد تو اس پر کفارہ بھی نہیں، البتہ آخرت کا عذاب ہے۔ ۔ ۔ ۔ قصاص اور دیت کے ساقط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قید ہونے کی وجہ سے وہ اہل حرب کا تابع ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی حیثیت اس مسلمان کی سی ہو گئی جس نے ہماری طرف ہجرت نہ کی ہو، اور اس حیثیت سے اس کی دنیوی عصمت ساقط ہو گئی۔

دیکھیے ان مثالوں میں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کا فرق کس قدر نمایاں ہے۔ اعتقادی قانون مسلمانوں کو ایک قوم اور کفار کو دوسری قوم قرار دیتا ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال اور عزت کو کافر کی جان و مال اور عزت پر ترجیح دی جائے۔ لیکن دستوری قانون اس عالمگیر تقسیم کے بجائے اپنے حدود عمل (جورسڈکشن) کو حدود ارضی (Territorial Limits) تک محدود کرتا ہے۔ سلطنت اسلامیہ کے حدود میں جو جان ہے، جو مال ہے، جو شے ہے وہ "معصوم" ہے،

خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی، کیونکہ سلطنت کا قانون اس کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے۔ اور ان حدود کے باہر جو چیز ہے "غیر معصوم" ہے، خواہ وہ مسلم کی ہو یا کافر کی۔ اسلامی حدود کے اندر کوئی چوری کرے گا تو ہم ہاتھ کاٹیں گے، قتل کرے گا تو ہم قصاص یا دیت وصول کریں گے، ناجائز ذرائع سے مال لے گا تو واپس دلائیں گے۔ اور ان حدود کے باہر کوئی مسلمان یا ذمی ایسا فعل کرے جو ہمارے قانون کی رُو سے جرم ہو تو ہم نہ علاقہ غیر میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں نہ اپنے علاقہ میں واپس آنے کے بعد، اس لیے کہ فعل ان حدود میں ہوا ہے جہاں قیامِ امن اور حفاظت جان و مال کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے دنیوی حیثیت سے ہے۔ حدودِ اسلامی سے باہر جو گناہ کیا جائے گا وہ دنیوی حکومت کے حدودِ عمل سے باہر ہونے کے باعث صرف دنیوی مواخذہ سے چھوٹ جائے گا۔ البتہ اللہ کے مواخذہ سے نہ چھوٹے گا، کیونکہ اللہ کی عمل داری حدودِ ارضی سے ناآشنا (Ultra territorial) ہے، اس نے جو کچھ حرام ٹھہرایا ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قانون نہیں ہے بلکہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے۔ وہی قرآن جو ایک طرف فَإِنْ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ اور وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا کہتا ہے، دوسری طرف وہی قرآن حدودِ اسلامی کے اندر رہنے والے مسلمان اور علاقہ غیر میں رہنے والے مسلمان کے خون میں فرق بھی کرتا ہے۔ اوّل الذکر کو دانستہ قتل کرنے والے پر کفارہ بھی ہے اور دیت بھی —— اور موخر الذکر کے قاتل پر صرف کفارہ[1] ہے۔

---

[1] وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ" سے یہ مراد ہے کہ اگر علاقہ غیر میں رہنے والا مسلمان کسی ایسی قوم سے ہو جس سے خون بہا کے باب میں مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو تو جس طرح اس قوم کے ایک غیر مسلم فرد کا خون بہا دیا جائے گا اسی طرح اس کے ایک مسلمان فرد کا بھی دیا جائے گا۔ پس یہ خون بہا معاہدہ کی بنا پر ہے نہ کہ عصمتِ اسلامی کی بناء پر (ملاحظہ ہو سورۂ نساء رکوع ۱۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسامہ بن زید کو ایک سریہ کا افسر بنا کر حرقات کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہاں ایک شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ کر جان بچانا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو اُسامہ کو بلا کر آپ بار بار فرماتے ہیں "من لک بلا الٰہ الا اللہ یوم القیمۃ"۔ "قیامت کے روز تجھے لا الٰہ الا اللہ کے مقابلہ میں کون بچائے گا" مگر اس مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم نہیں دیتے[1]۔ ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر حدود اسلامی سے باہر رہنے والے چند مسلمان مارے جاتے ہیں تو حضورؐ فرماتے ہیں "انا بریٔ من کل مسلم یقیم بین اظھر المشرکین"۔ "میں ہر ایسے مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو[2]" خود قرآن میں بھی ایسے مسلمان کی ذمہ داری سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا۔ (الانفال - ۷۲)

اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام میں) نہ آ گئے ان سے تمہارا "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں[3]۔

---

[1] ابو داؤد، باب علی ما یقاتل المشرکین۔

[2] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب مذکور۔ اس دوسرے واقعہ میں حضورؐ نے مقتولوں کی نصف دیت دلوائی تھی۔ اغلب ہے کہ آپ کا یہ فعل اُس آیت کے نزول سے پہلے کا ہو گا جس میں ایسے مقتول کی دیت ساقط کی گئی ہے۔

[3] یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی نہایت اہم دفعات میں سے ہے۔ اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ "ولایت" کے تعلقات صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہوں گے جو دار الاسلام کے باشندے ہوں یا باہر سے دار الاسلام میں ہجرت کر کے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۱ پر)

اس طرح قرآن اور حدیث نے خود ہی دنیوی عصمت کو دینی عصمت سے الگ کر دیا ہے اور دونوں کے حدود بتا دیئے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام میں صرف امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ہی ایسے فقیہ ہیں جنہوں نے اس نازک اور پیچیدہ قانونی مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے۔ امام ابو یوسف، امام محمدؒ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر مجتہدین بھی ان دونوں قسم کی عصمتوں میں پوری پوری تمیز نہیں کر سکے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر دار الکفر میں اسلامی رعایا کا ایک فرد دوسرے کو قتل کر دے تو یہ سب حضرات بالاتفاق فرماتے ہیں کہ قاتل سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک شخص کو قتل کیا جو "معصوم بالاسلام" تھا۔[1] پس جب اتنے بڑے بڑے آئمہ اس مسئلہ میں مختلط ہو گئے ہیں تو کچھ

(بقیہ صفحہ ۳۱۰ سے) آجائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو دار الاسلام سے باہر رہتے ہوں، یا دار الاسلام میں آئیں بھی تو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دار الکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے آئیں، تو ان کے اور اہل دار الاسلام کے درمیان "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ "ولایت" کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات پر بولا جاتا ہے اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے اور خود شہریوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ پس یہ آیت دار الاسلام سے باہر کے مسلمانوں کو دینی اخوت کے باوجود اس سیاسی و تمدنی رشتے سے خارج کر دیتی ہے، اور اس سے وسیع قانونی نتائج نکلتے ہیں جن کی تفصیلات فقہ کی مبسوط کتابوں میں موجود ہیں۔ مثلاً اسی "عدم ولایت" کا نتیجہ ہے کہ دار الاسلام اور دار الکفر کے مسلمان آپس میں شادی بیاہ نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے۔ اسلامی حکومت کسی ذمہ داری کے منصب پر کسی ایسے مسلمان کو مامور نہیں کر سکتی جس نے رعیت ہونے کا تعلق دار الکفر سے نہ توڑا ہو۔

[1] ملاحظہ ہو الجامع الصغیر اور فتاویٰ قاضی خاں۔

بعید نہیں کہ فقہ حنفی کے متاخر شارحین کو بھی امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی بات سمجھنے میں یہی غلط پیش آیا ہو۔

دارالحرب اور دارالکفر کا اصطلاحی فرق

امام اعظم کے متعلق ہم کو تحقیق ہے کہ اوپر جتنے مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں اور اسی قبیل کے دوسرے مسائل میں انہوں نے دارالحرب کے بجائے "دارالکفر" کی اصطلاح استعمال کی تھی، کیونکہ دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دارالاسلام کا مقابل دارالکفر بمعنی علاقۂ غیر (Foreign territory) ہی ہو سکتا ہے، حرب اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں جو ممالک اسلامی سلطنت سے صلح رکھتے ہوں وہ بھی دارالکفر ہیں۔ اور ان سے بھی وہ سب احکام متعلق ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دارالکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے وہ عموماً دارالحرب ہی میں رہتے تھے، اس لیے بعد کے فقہاء نے دارالکفر کو بالکل دارالحرب کا ہم معنی سمجھ لیا اور ان دونوں اصطلاحوں کے باریک قانونی فرق کو نظر انداز کر گئے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رح کے کلام میں ہم کو کسی جگہ کوئی ایسا لفظ نہیں ملا جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ "غیر معصوم" کو "مباح" کے معنی میں لیتے ہیں۔ وہ حدود دار اسلام سے باہر کی اشیاء کو "غیر معصوم" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور ایسی اشیاء پر دست درازی کرنے والے کے لیے صرف اتنا کہتے ہیں لاشئ علیہ۔ یالم یقض علیہ وغیرہ۔ یعنی اس پر کوئی گرفت نہیں، یا اس کے خلاف کوئی عدالتی فیصلہ صادر نہ کیا جائے گا۔ لیکن بعد کے فقہاء نے اکثر مقامات پر "عدم عصمت" اور "اباحت" کو خلط ملط کر دیا جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ حدودِ اسلامی سے باہر جتنے ممنوع افعال کیے جائیں ان پر جس طرح حکومت اسلامی باز پرس نہیں کرے گی اسی طرح خدا بھی باز پرس نہیں کرے گا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ آپ ہندوستان میں کسی کا مال چرا لیجیے۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کی عدالت میں آپ پر مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔ دارالاسلام کے

قانون کی رُو سے آپ بری الذمہ ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی کب ہیں کہ خدا کی عدالت سے بھی آپ چھوٹ گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کے اندر سود اور قمار اور دوسرے عقود فاسدہ کی اباحت کا جو مسئلہ اس بنا پر لکھا گیا ہے کہ حربی کے لیے کوئی "عصمت" (Protection) نہیں تو اس کے دو پہلو ہیں:۔

ایک یہ کہ دارالحرب سے مراد محض "علاقہ غیر" ہو۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ دستوری قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ "حربی" (بمعنی رعیتِ غیر) کے مال کی حفاظت کا ذمہ چونکہ ہم نے نہیں لیا ہے اس لیے ہمارے حدودِ عمل سے باہر ہماری سلطنت کا کوئی شہری اگر اس سے سُود لے کر یا جوا کھیل کر یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لے کر ہمارے علاقہ میں آ جائے تو ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہ کریں گے، قطع نظر اس سے کہ دین و اعتقاد کے نقطۂ نظر سے وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

دُوسرا پہلو یہ ہے کہ دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو یعنی (Enemy Country) اس لحاظ سے یہ مسئلہ تعلقاتِ خارجیہ کے قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کو ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

تعلقات خارجیہ کا قانون

اسلامی قانون کا یہ شعبہ اُن لوگوں کے جان و مال کی قانونی حیثیات سے بحث کرتا ہے جو اسلامی حکومت کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے چند امور کی توضیح ضروری ہے۔

فقہی اصطلاح میں لفظ "دار" قریب قریب انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں انگریزی لفظ (Territory) بولا جاتا ہے۔ جن حدودِ ارضی میں مسلمانوں کو حقوق شاہی حاصل ہوں وہ "دارالاسلام" ہیں، اور جو علاقہ ان حدود سے خارج ہو وہ "دار الکفر" یا "دارالحرب" ہے۔ تعلقات خارجیہ کا قانون تمام تر انہی مسائل سے بحث کرتا ہے جو اس ارضی تفریق یا اختلافِ دارین سے نفوس اور اموال کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اعتقادی حیثیت سے تو تمام مسلمان اسلامی قومیت کے افراد (National) ہیں۔ لیکن اس شعبۂ قانون کی اغراض کے لیے ان کو تین اقسام پر منقسم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو دارالاسلام کی رعایا (Citizens) ہوں۔ دوسرے وہ جو دارالکفر یا دارالحرب کی رعایا ہوں، تیسرے وہ جو رعایا تو دارالاسلام ہی کی ہوں مگر مستامن کی حیثیت سے عارضی طور پر دارالکفر یا دارالحرب میں جائیں اور مقیم ہوں۔ ان سب کے حقوق اور واجبات الگ الگ متعین کیے گئے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں کفار اگرچہ سب کے سب اعتقاداً اسلامی قومیت سے خارج ہیں، مگر قانوناً ان کو بھی ان کے حالات کے لحاظ سے متعدد اقسام پر منقسم کیا گیا ہے ایک وہ جو پیدائشی ذمّی (Natural Born subjects) ہوں یا وضع جزیہ و خراج کے ذریعہ سے جن کو ذمّی بنا لیا گیا ہو (Naturalised subjects) دوسرے وہ جو دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں، بلکہ مستامن کی حیثیت دارالاسلام میں آئیں اور رہیں (Domiciled Aliens) تیسرے وہ جو دارالکفر یا دارالحرب کی رعایا ہوں اور امان کے بغیر دارالاسلام میں داخل ہو جائیں۔ چوتھے وہ جو اپنے ہی دار میں ہوں۔ پھر اس آخری قسم کے کفار کی بھی متعدد اقسام ہیں ایک وہ جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ نہ ہو مگر دشمنی بھی نہ ہو۔ دوسرے وہ جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہیں مگر ان کی حدود میں احکام اسلامی جاری نہ ہوں تیسرے وہ جن سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر دشمنی بھی نہ ہو چوتھے وہ جن سے مسلمانوں کی دشمنی ہو۔

اس طرح حدود ارضی یعنی دار (Territory) کے لحاظ سے اشخاص اور املاک کی حیثیات میں جو فرق ہوتا ہے اور اس فرق کے لحاظ سے ان کے درمیان احکام میں جو تمیز کی جاتی ہے اس کو مدِّ نظر رکھنا قانونِ اسلامی کی صحیح تعبیر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب کبھی ان فروق اور امتیازات کا لحاظ کیے بغیر محض قانونی عبارات کے الفاظ کی پیروی کی جائے گی تو صرف ایک سُود کے مسئلہ ہی میں نہیں بلکہ بکثرت

فقہی مسائل میں ایسی غلطیاں پیش آئیں گی جن سے قانون مسخ ہو جائے گا اور اپنے مقاصد کے خلاف استعمال کیا جانے لگے گا۔

ان ضروری توضیحات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ دارالحرب کا اطلاق دراصل کن علاقوں پر ہوتا ہے، کن مراتب کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے احکام کیا ہیں، حربیت کے کتنے مدارج ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اباحت نفوس واموال کی نوعیت کس طرح بدلتی ہے۔ پھر اختلاف دارین کے لحاظ سے خود مسلمان کی حیثیات میں کیا فرق ہوتا ہے اور ہر حیثیت سے ان کے حقوق و واجبات کس طرح بدلتے ہیں۔

کفّار کی اقسام

کفار کی جو اقسام ہم نے اُوپر بیان کی ہیں ان میں سے اہل ذمہ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ بجز خمر و خنزیر اور نکاحِ محارم اور عبادت غیر اللہ کے اور تمام معاملات میں ان کی حیثیت وہی ہے جو مسلمانوں کی ہے۔ اسلام کے ملکی قوانین ان پر جاری ہوتے ہیں، وہ ان سب چیزوں سے روکے جاتے ہیں جن سے مسلمان روکے جاتے ہیں، اور ان کو عصمت جان و مال و آبرو کے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ مستامن کافروں کا معاملہ بھی ذمیوں سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ ان پر بھی اسلامی حکومت کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور دارالاسلام ہونے کی وجہ سے ان کو بھی عصمتِ جان و مال حاصل ہوتی ہے۔ ان کو الگ کرنے کے بعد اب ہمیں صرف ان کفار کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیے جو دارالکفر میں مقیم ہوں۔

۱۔ باج گذار

وہ کفار جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہوں اور جن کو اپنے ملک میں احکام کفر جاری کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ ان کا ملک اگرچہ دارالکفر ہے مگر دارالحرب نہیں۔ اس لیے کہ جب مسلمانوں نے ادائے خراج پر انہیں امان دے دی تو حربیت مرتفع ہوگئی۔ قرآن میں آیا ہے کہ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ

السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء: ۹۰) یعنی" اگر وہ جنگ سے باز آجائیں اور صلح پیش کریں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی سبیل نہیں رکھی" اسی بنا پر فقہا نے تصریح کی ہے کہ ان کے اموال اور نفوس اور اعراض سے تعرض نہیں کیا جاسکتا۔

وَإِنْ وَقَعَ الصُّلْحُ عَلَى أَنْ يُؤَدُّوا إِلَيْهِمْ كُلَّ سَنَةٍ مِائَةَ رَأْسٍ فَإِنْ كَانَتْ هٰذِهِ الْمِائَةُ الرَّأْسِ يُؤَدُّونَهَا مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَوْلَادِهِمْ لَمْ يَصْلُحْ هٰذَا لِأَنَّ الصُّلْحَ وَقَعَ عَلَى جَمَاعَتِهِمْ فَكَانُوا جَمِيعًا مُسْتَأْمِنِينَ واسترقاق المستامن لَا يَجُوزُ۔ (المبسوط للامام السرخسی ج ۱۰، ص ۸۸)

اور اگر ان سے اس بات پر صلح ہوئی ہو کہ وہ ہر سال سو غلام دیں گے تو یہ سو غلام اگر خود انہی کی جماعت میں سے ہوں یا ان کی اولاد ہوں تو ان کا لینا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ صلح کا اطلاق ان کی پوری جماعت پر ہوا ہے اور وہ سب مستامن ہیں اور مستامن کو غلام بنانا جائز نہیں۔

وَلَوْ دَخَلَ مِنْهُمْ دَارَ حَرْبٍ أُخْرَى فَظَهَرَ الْمُسْلِمُونَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَتَعَرَّضُوا لَهُ لِأَنَّهُ فِي أَمَانِ الْمُسْلِمِينَ۔

(ایضاً ص ۸۹)

اگر ان میں سے کوئی شخص کسی دوسرے دار الحرب میں مقیم ہو اور اسلامی فوجیں اس ملک میں داخل ہوں تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا کیوں کہ وہ مسلمانوں کی امان میں ہے۔

وَإِنْ كَانَ الَّذِينَ سَبَوْهُمْ قَوْمٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ غَدَرُوا بِأَهْلِ الْمُوَادَعَةِ لَمْ يَسَعِ الْمُسْلِمِينَ أَنْ يَشْتَرُوا مِنْهُمْ ذَاتَ الْبَيْعِ لِأَنَّهُمْ كَانُوا فِي أَمَانِ الْمُسْلِمِينَ۔ (ایضاً ص ۹۷)

اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت ان کے ساتھ غدر کرکے ان کے

آدمیوں کو غلام بنالے تو مسلمانوں کے لیے ان غلاموں کا خریدنا جائز نہ ہوگا اور اگر انہوں نے خرید لیا تو اس بیع کو رد کر دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی امان میں تھے۔

اس قسم کے کفار اگرچہ نظری حیثیت سے اہل حرب ضرور رہتے ہیں لانھم بھذہ الموادعۃ لا یلتزمون احکام الاسلام ولا یخرجون من ان یکونوا اھل حرب۔[1] (المبسوط ج۔ ۱ص ۸۸) لیکن ان کے اموال مباح نہیں اور ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ سود خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ اگر وہ اپنے دار میں بھی نہ ہوں، کسی ایسے دار میں ہوں جہاں بالفعل جنگ ہو رہی ہو تب بھی مسلمانوں کے لیے ان سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

۲۔ معاہدین

وہ کفار جن سے دار الاسلام کا معاہدہ ہو۔ ان کے متعلق قرآن کی تصریحات حسب ذیل ہیں:۔

> اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ۔ (التوبۃ: ۴)
>
> مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کر لیا اور انہوں نے تمہارے ساتھ وفائے عہد میں کمی بھی نہ کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان کے ساتھ تم معاہدہ کی مدت مقررہ تک عہد پورا کرو۔
>
> فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ۔ (التوبۃ: ۷)
>
> پھر جب تک وہ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔

---

[1] کیونکہ اس صلح و معاہدہ سے وہ احکام اسلام کی پیروی کے پابند تو ہو نہیں جاتے اس لیے وہ اہل حرب ہونے سے خارج نہیں ہوتے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ (الانفال: ۷۲)

اور جو مسلمان دار الکفر میں رہتے ہوں وہ اگر دین کے حق کی بنا پر تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرو مگر کسی ایسی قوم کے خلاف ان کی مدد نہ کرو جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ (النساء: ۹۲)

اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو دیت دی جائے گی۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ معاہد کفار اگرچہ نظری حیثیت سے حربی ہیں اور ان کے ملک پر دار الحرب کا اطلاق ہو سکتا ہے، مگر جب تک اسلامی حکومت نے ان سے معاہدانہ تعلقات قائم رکھے ہیں، وہ مباح الدم والاموال نہیں ہیں اور ان کی جان و مال سے تعرض کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان کا خون بہائے گا تو دیت لازم آئے گی، اور اگر ان کے مال سے تعرض کرے گا تو ضمان دینا ہوگا۔ پس جب ان کے اموال مباح ہی نہیں ہیں تو ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کا جواز تو اباحت ہی کی اصل پر مبنی ہے۔

۳- اہل غدر

وہ کفار جو معاہدہ کے باوجود معاندانہ رویہ اختیار کریں۔ ان کے متعلق قرآن کا حکم یہ ہے کہ:-

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ (الانفال: ۵۸)

اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک

دو[1]

شمس الائمہ سرخسی اس صورت مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ولکن یَنْبَغِیْ اَنْ یَنْبِذَ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اَیْ عَلٰی سَوَآءٍ مِنْکُمْ وَمِنْھُمْ فِی الْعِلْمِ بِذٰالِکَ فَعَرَفْنَا اَنَّہٗ لَایَحِلُّ قِتَالُھُمْ قَبْلَ النَّبْذِ وَقَبْلَ اَنْ یَعْلَمُوْا بِذٰالِکَ۔ (المبسوط ج ۱۰ ص ۸۷)

(ایسی صورت میں معاہدہ کو توڑ دینا جائز ہے) مگر لازم ہے کہ نقضِ معاہدہ برابری کے ساتھ ہو، یعنی تمہاری طرح ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ تم نے معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ اس حکم سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اعلان و اطلاع سے پہلے ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال نہیں ہے۔

یہ آیت اور اس کی مذکورۂ بالا قانونی تعبیر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ معاہد قوم اگر بدعہدی بھی کرے تب بھی اعلانِ جنگ سے پہلے اس کے نفوس و اموال مباح نہیں ہیں۔[2]

---

[1] یعنی علی الاعلان معاہدہ ختم ہونے کی اطلاع انہیں دے دو تاکہ اس علم میں تم اور وہ برابر ہو جائیں کہ معاہدہ اب باقی نہیں ہے۔

[2] اس حکم سے صرف وہ حالت مستثنیٰ ہے جب کہ کسی معاہد قوم نے علانیہ اپنا معاہدہ توڑ دیا ہو اور صریح طور پر ہمارے حقوق پر کوئی دست درازی یا ہمارے خلاف کوئی محاربانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی حالت میں ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم بھی اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کریں۔ فقہائے اسلام نے اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے استشہاد کیا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپ نے پھر انہیں فسخِ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تمام حالات کو سامنے رکھیں (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

۴۔غیر معاہدین

وہ کفار جن سے معاہدہ نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کو ہمیشہ بین الاقوامی تعلقات میں جنگ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی تعلقات کا انقطاع (Rupture of Diplomatic Relations) دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ دونوں قومیں اب

(جن میں حضورؐ نے نبذ عہد کو ضروری نہ سمجھا) اور اس پورے طرز عمل کی پیروی کریں جو ایسی حالت میں آپؐ نے اختیار کیا۔

اوّلاً:۔ قریش کی خلاف ورزی عہد ایسی صریح تھی جس کے نقص عہد ہونے میں کسی قسم کا التباس نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ فی الواقع ان سے بدعہدی کا فعل سرزد ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا جس کے صاف معنی یہ تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ بات ضروری نہیں ہے کہ خود ناقض عہد قوم کی طرف سے بھی نقض عہد کا اعتراف ہو، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کا نقض عہد بالکل غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحۃً یا اشارۃً یا کنایۃً کوئی ایسا فعل نہیں کیا جس سے یہ ایماء نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک قریش کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً: قریش کے خلاف جنگی کاروائی آپ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپ کے طرز عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح و بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال کیا ہو ــــ یہ اس معاملہ میں حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کے حکم فانبذ الیھم علیٰ سواء سے ہٹ کر اگر کوئی کاروائی کی جاسکتی ہے تو صرف اُن حالات میں اور اس طرح کی جاسکتی ہے جن میں اور جس طرح حضورؐ نے ایسی کاروائی کی۔

باہمی احترام کی قیود سے آزاد ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ایک قوم دوسری قوم کے آدمیوں کو قتل کر دے یا لوٹ لے تو کوئی دیت یا ضمان واجب نہ ہوگا۔ اس معنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قوموں کے لیے ایک دوسرے کے نفوس و اموال مباح ہیں۔ مگر کوئی مہذب حکومت باقاعدہ اعلان جنگ کیے بغیر کسی انسانی جماعت کا خون بہانا یا مال لوٹنا پسند نہیں کرسکتی۔ اسلامی قانون اس باب میں یہ ہے:-

وَلَوْ قَاتَلُوهُمْ بِغَيْرِ دَعْوَةٍ كَانُوا آثِمِينَ فِي ذٰلِكَ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يَضْمَنُونَ شَيْئًا مِمَّا اتْلَفُوا مِنَ الدِّمَاءِ وَالْأَمْوَالِ عِنْدَنَا۔ (المبسوط ج۱۰ص۳۰)

اگر مسلمانوں نے دعوت[1] کے بغیر ان سے جنگ کی تو گناہ گار ہوں گے۔ لیکن ایسی جنگ میں ان کی جان و مال کا جو اتلاف وہ کریں گے اس میں سے کسی چیز کا ضمان حنفیہ کے نزدیک مسلمانوں پر لازم نہ آئے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ضمان لازم آئے گا کیوں کہ جب تک وہ دعوت کو رد نہ کریں ان کی جان و مال کی حرمت و عصمت باقی ہے۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں:-

وَلٰكِنَّا نَقُولُ الْعِصْمَةُ الْمُقَوِّمَةُ تَكُونُ بِالْإِحْرَازِ وَذٰلِكَ لَمْ يُوجَدْ فِي حَقِّهِمْ ...... وَلٰكِنْ شَرْطُ الْإِبَاحَةِ تَقْدِيمُ الدَّعْوَةِ فَبِدُونِهِ لَا يَثْبُتُ وَمُجَرَّدُ حُرْمَةِ الْقَتْلِ لَا يَكْفِي بِوُجُوبِ الضَّمَانِ۔ (ایضاً ص ۳۰-۳۱)

جس عصمت کی بنا پر جان و مال کی قیمت قائم ہوتی ہے تو وہ دارالاسلام

---

[1] دعوت سے مراد یہ ہے کہ ان کو الٹی میٹم دیا جائے کہ یا تو ہم سے صلح و معاہدہ کرو یا جزیہ دو یا مسلمان ہو کر ہماری قومیت میں شامل ہو۔ اگر ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت تم قبول نہیں کرتے تو ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔

کی حفاظت میں ہونے پر موقوف ہے اور یہ چیز ان کے حق میں موجود نہیں ہے۔ . . . . . یہ ضروری ہے کہ اباحت کے لیے تقدیم دعوت شرط ہے، اس کے بغیر اباحت ثابت نہیں ہوتی، لیکن محض حُرمتِ قتل، وجوب ضمان کے لیے کافی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حربی کفار جو ذمی نہیں ہیں، جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے، جن کا دار ہمارے دار سے مختلف ہے جن کی عصمت ہمارا قانون تسلیم نہیں کرتا، اُن کے نفوس و اموال بھی ہم پر اس وقت تک حلال نہیں ہیں جب تک کہ اتمام حجت نہ ہو اور ہمارے اور ان کے درمیان باقاعدہ اعلانِ جنگ نہ ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں حضرت معاذ بن جبل کو جو ہدایات دی تھیں وہ قابلِ غور ہیں:-

لَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى تَدْعُوْهُمْ فَاِنْ اَبَوْا فَلَا تُقَاتِلُوهم حَتّٰى يَبْدَءُوْكُمْ فَاِنْ بَدَءُوْكُمْ فَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى يَقْتُلُوْا مِنْكُمْ قَتِيْلًا ثُمَّ اروهم ذٰلِكَ الْقَتِيْلَ وَقُوْلُوا لَهُمْ هَلْ اِلٰى خَيْرٍ مِنْ هٰذَا سَبِيْلٌ فَلَاَنْ يَهْدِيَ اللهُ تعالىٰ عَلٰى يَدَيْكَ خَيْرٌ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ وَغَرَبَتْ۔

ان سے جنگ نہ کرنا جب تک کہ ان کو دعوت نہ دے لو۔ پھر اگر وہ انکار کریں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک وہ ابتدا نہ کریں۔ پھر اگر وہ ابتدا کریں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کر دیں۔ پھر اس مقتول کو دکھا کر ان سے کہنا کہ کیا اس سے زیادہ بہتر کسی بات کے لیے تم آمادہ نہیں ہو سکتے؟ اے معاذ اس قدر صبر و تحمل کی تعلیم اس لیے ہے کہ اگر اللہ تیرے ہاتھ پر لوگوں کو ہدایت بخش دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تیرے قبضہ میں مشرق سے مغرب تک کا سارا ملک و مال آجائے۔

۵۔ محاربین

اب صرف وہ کفار باقی رہ جاتے ہیں جن سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو۔ اصلی حربی یہی ہیں۔ انہی کے دار کو تعلقات خارجیہ کے قانون میں "دار الحرب" کہا جاتا ہے انہی کے نفوس اور اموال مباح ہیں اور انہی کو قتل کرنا، گرفتار کرنا، لوٹنا اور مارنا شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن حربیت (Enemy Character) تمام محاربین میں یکساں نہیں ہے اور نہ تمام اموال حربیہ ایک ہی حکم میں ہیں۔ حربی کافروں کی عورتیں، ان کے بچے، ان کے بیمار، ان کے بوڑھے اور اپاہج وغیرہ بھی اگرچہ حربی ہیں، مگر شریعت نے ان کو مباح الدم نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ اباحتِ قتل کو صرف مقاتلین (Combatants) تک محدود رکھا ہے۔ انما یقتل من یقاتل۔ قال اللہ تعالیٰ وقاتلوھم۔ والمفاعلۃ تکون من الجانبین[ل] (المبسوط ج ۱۰ ص ۶۴) اسی طرح اموال حربیہ میں بھی شریعت نے فرقِ مدارج کیا ہے اور ہر درجہ کے احکام الگ ہیں۔

اموال حربیہ کے مدارج اور احکام

اگرچہ اصولی حیثیت سے تمام وہ اموال و املاک جو دشمن کے علاقہ میں ہوں، مباح (Confiscable) ہیں، لیکن شریعت اسلامی نے ان کو دو اقسام پر منقسم کیا ہے، ایک غنیمت دوسرے فَے:۔

غنیمت

وہ اموال منقولہ (Moveable Properties) جن پر رقبہ جنگ میں اسلامی فوج اپنے اسلحہ کی طاقت سے قابض ہو، اموال غنیمت ہیں۔ ان کا $\frac{1}{5}$ حصہ (یعنی خمس) حکومت کا حق ہے اور $\frac{4}{5}$ ان لوگوں کا حق جنہوں نے انکو لوٹا ہو۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ

[ل] قتل صرف وہ کیا جائے گا جو ہم سے مقاتلہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقاتلوھم (مقاتلہ کرو) فرمایا ہے، اور مقاتلہ جانبین سے ہوتا ہے، نہ کہ صرف ایک جانب سے۔

کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

فَهٰذا فِيمَا يُصِيبُ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ عَسَاكِرِ اَهْلِ الشِّرْكِ وَمَا اَجْلَبُوْا بِهٖ مِنَ الْمَتَاعِ وَالسِّلَاحِ وَالْكُرَاعِ۔ (ص ۔ ۱)

خمس ان اموال میں ہے جو مسلمانوں کو اہل شرک کے لشکروں سے ہاتھ لگیں اور جو سازوسامان اور ہتھیار اور جانوروں کی قسم سے ہوں (یعنی اموال منقولہ)

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:۔

فَمَا اَصَابَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ عَسَاكِرِ اَهْلِ الشِّرْكِ وَمَا اَجْلَبُوْا بِهٖ مِنَ الْمَتَاعِ وَالْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔

اس سے ظاہر ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کارروائی (War like operations) کے دوران میں غنیم کے لشکروں سے حاصل ہوں۔ لشکروں سے باہر عام آبادیوں کو لوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔ اگرچہ دارالحرب کے تمام اموال مباح ہیں اور اگر کوئی شخص غیر مقاتلین کے اموال سے تعرض کرے تو اس پر نہ کوئی ضمان لازم ہوگا، نہ لوٹے ہوئے اموال واپس کیے جائیں گے، لیکن اس قسم کی لوٹ مار پسندیدہ نہیں ہے۔ امام مسلمین ہر ممکن طریقہ سے اپنی فوجوں کو ایسی حرکات سے روکے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

مَنْ غَزَا فَخْرًا وَرِيَاءً وَسُمْعَةً عَصَى الْاِمَامَ وَاَفْسَدَ فِي الْاَرْضِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَرْجِعْ بِالْكَفَافِ[1]

(ابوداود باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا)

---

[1] جس شخص نے فخر کی نیت سے، اور دنیا کو اپنی قوت و شجاعت دکھانے کے لیے اور ناموری حاصل کرنے کے لیے جنگ کی اور امام کی نافرمانی کی، اور زمین میں فساد برپا کیا، اسے اجر ملنا تو درکنار وہ تو برابر بھی نہ چھوٹے گا۔

وَإِذَا دَخَلَ المسلمُ دارَالحرب بِامانٍ ولـه فِى ایدیهم جَاریـةٌ ماسورۃٌ کُرهتُ لـهٗ غصبها و وطیها لِانّهم مَلکُوها عَلَیہ وَالتحقتْ بِسائِرِ امْلَاکِهم۔ (ایضًا۔ ص ۶۵)

اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں امان لے کر داخل ہو اور وہاں خود اسی کی لونڈی اس کے ہاتھ آئے جسے کفار پکڑ لے گئے تھے تو اس کے لیے اس لونڈی پر قبضہ کرنا اور اس سے وطی کرنا جائز نہیں کیونکہ اب کفار اس کے مالک ہیں اور وہ لونڈی ان کے املاک میں داخل ہو چکی ہے۔

وَلَوخَرجَ اِلَیْنَا بامانٍ وَمَعه ذالك المالُ فانہ لا یتعرض لهٗ فیہ۔ (ایضًا ص ۶۳)

اور اگر کافر حربی ہمارے دار میں امان لے کر آئے اور اس کے ساتھ خود ہم ہی سے لوٹا ہوا مال ہو تو ہم اس سے وہ مال نہیں چھین سکتے۔

فَاِنْ غَلَبَ العَدوعَلی مالِ المسلمین فاحرزوہ وهناك مسلم تاجر مستامن حل لہ ان یشتریه منهم فیاکل الطعام من ذٰلكَ ویطاء الجاریة لانهم ملکوها بالاحراز فالتحقت بسائرِ املاکهم وهذا بخلاف مالو دخل الیهم تاجرٌ بامانٍ فسَرق منهم جاریةً واخرجها لم یحل للمسلم ان یشتریها منه لانّه احرزها علی سَبیلِ الغَدرِ وهو مامور بردِّها علیهم فیما بَیْنَه وبین ربّه وان کان لا یجبرہٗ الامامُ علیٰ ذٰالِكَ۔ (ایضًا ص۔ ۹۱)

اگر دشمن مسلمانوں کے مال پر قابض ہو کر اسے اپنے دار میں لے

جائے اور وہاں کوئی مسلمان تاجر مستامن ہو تو اس کے لیے اس
مال کو خریدنا اور کھانا حلال ہے اور وہ ان سے خریدی ہوئی لونڈی
سے وطی بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اپنے دار میں لے جانے کے بعد وہ
اس کے مالک ہو گئے اور اب وہ ان کے املاک میں شامل ہے۔
بخلاف اس کے اگر کوئی تاجر امان لے کر دار الحرب میں جائے اور ان
کے قبضہ سے کسی لونڈی کو چرا کر دار الاسلام میں لے آئے تو مسلمان
کے لیے اس لونڈی کو خریدنا حلال نہیں کیونکہ وہ غدر کر کے اسے لایا
ہے۔ اور فیما بینہ و بین اللہ وہ اسے واپس کرنے پر مامور
ہے۔ اگرچہ امام اس کو واپس کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

یہ مسلک ٹھیک ٹھیک حدیث کے مطابق ہے۔ فتح مکہ کے روز جب حضرت علی رضی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ اپنے اُس مکان میں کیوں نہیں قیام فرماتے جو ہجرت سے پہلے آپؐ کا تھا تو حضور ؐ نے جواب دیا کہ ھل ترک لنا عقیل من ربع۔ "عقیل نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے" اس کے معنی یہ ہیں کہ جب آپؐ اسے چھوڑ کر نکل گئے تھے اور عقیل بن ابی طالب نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، تو اُس پر سے آپؐ کی ملک ساقط اور عقیل کی ملکیت ثابت ہو گئی۔ اب باوجود اس کے کہ آپؐ نے مکہ فتح کر لیا تھا، آپؐ نے اپنے سابق حقوق ملکیت کی بنا پر اس مکان کو اپنا مکان قرار دینے سے خود انکار فرما دیا۔

مباحث گزشتہ کا خلاصہ

یہ تمام قانونی تصریحات آپ کے سامنے ہیں ان پر غور کرنے سے حسب ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) دار الحرب اگر مطلقاً دار الکفر (Foreign territory) کے معنی میں لیا جائے تو اس کے اموال مباح نہیں بلکہ صرف غیر معصوم ہیں اور عدم عصمت کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ اسلامی حکومت اس دار میں کسی جان یا مال کے تحفظ کی ذمہ دار

نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی مسلمان کسی مسلم یا غیر مسلم کو جان و مال کا نقصان پہنچائے گا یا اس کی ملک سے کوئی چیز حرام طریقہ سے نکال لے گا تو یہ اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ اسلامی حکومت اس سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گی۔

(۲) دارالحرب سے مراد اگر ایسے کفار کا دار لیا جائے جن کے نفوس و اموال مباح ہیں تو اس معنی میں ہر دارالکفر دارالحرب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ علاقہ دار الحرب ہے جس سے بالفعل دارالاسلام کی جنگ ہو۔ اس خاص نوع کے دارالکفر کے سوا کسی دوسرے دارالکفر کے باشندے نہ مباح الدم ہیں اور نہ مباح المال، اگرچہ وہ ذمی نہیں ہیں اور ان کے نفوس و اموال غیر معصوم ہیں۔

(۳) جس ملک سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو اس کے نفوس و اموال بھی مطلقاً ایسے مباح نہیں ہیں کہ ہر شخص وہاں لوٹ مار کرتے اور کفار کی املاک پر قبضہ کرنے کا مختار ہو۔ بلکہ اس کے لیے بھی کچھ شرائط اور قیود ہیں:۔

(الف) امام مسلمین باقاعدہ اعلانِ جنگ کر کے اس ملک کو دارالحرب قرار دے، اور

(ب) وہاں جنگ کرنے والوں کو امام کا "اذن" اور اس کی "حمایت" حاصل ہو۔

(۴) غنیمت صرف اُس جائداد منقولہ کو کہتے ہیں جو دشمن کے عساکر سے لڑ کر حاصل کی جائے۔ یا بالفاظ دیگر اشرف جہات سے حاصل ہو اور جس میں دین کا اعزاز ہو۔ اس مال میں پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے۔

(۵) فَے اُن اموال منقولہ و غیر منقولہ کو کہتے ہیں جو نتیجۂ فتح کے طور پر حکومت اسلامی کے قبضہ میں آئیں۔ خراج اور مالِ صلح وغیرہ کا شمار بھی فَے ہی میں ہے، لیکن یہ بالکلیہ اسلامی حکومت کی ملک ہے، اور کسی شخص خاص کو اس پر حقوقِ ملکیت حاصل نہیں ہو سکتے۔

(۶) فَے اور غنیمت کے اموال پر فاتحین کو پورے حقوقِ ملکیت صرف اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب کہ وہ ان کو دارالحرب سے دارالاسلام منتقل کر لائیں

یا دار الحرب کو دار الاسلام بنا لیں - اس سے پہلے ان اموال میں تصرف کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے -

(۷) اسلامی قانون حربی کفار کے اموال پر اُن کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے - اور ان کی ملک سے کوئی مال مسلمانوں کی ملک میں جائز طور پر انہی صورتوں سے منتقل ہو سکتا ہے جن کو اللہ اور رسولؐ نے حلال کیا ہے ، یعنی بیع یا صلح یا جنگ -

مسلمانوں کی حیثیات بلحاظ اختلافِ دار

ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اسلامی قانون کے مطابق اختلاف دار کے لحاظ سے خود مسلمانوں میں کیا اختلافات واقع ہوتے ہیں - اس باب میں تمام قوانین کی بنیاد حسب ذیل آیات و احادیث پر قائم ہے -

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا - (الانفال: ۷۲)

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام) آنہیں گئے ، اُن سے تمہارا "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں تا وقتیکہ وہ (دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف) ہجرت نہ کریں -

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ -

(النساء: ۸۹)

ان کو ولی نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں -

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ - (النساء: ۹۲)

جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے اس کو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیئے اور اس کے وارثوں کو دیت دینی چاہیئے الایہ کہ ورثا صدقہ کے طور پر دیت چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہو اور ہو وہ مومن تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو دیت دی جائے اور ایک مسلمان بردہ آزاد کیا جائے۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا بَرِیْءٌ مِنْ کُلِّ مُسْلِمٍ اَقَامَ بَیْنَ اظھر المشرکین۔ وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایضًا مَنْ اَقَامَ مَعَ المشرکین فقد بَرِئَتْ مِنہ الذمۃ اوقال لَاذِمَّۃَ لہٗ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ہر اس مسلمان کی ذمہ داری سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔ اور حضور ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ جس نے مشرکین کے ساتھ قیام کیا اس سے بری الذمہ ہوں۔ یا فرمایا اس کے لیے کوئی ذمہ نہیں۔

ابوداؤد کی کتاب الجہاد میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو لشکر کا سردار مقرر کر کے بھیجتے تو اس کو منجملہ دوسری ہدایات کے ایک یہ ہدایت بھی فرماتے تھے:۔

اُدْعُھُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَجَابُوْكَ فَاقبل منھم

لہ "میں" کا لفظ آپ نے حکومت اسلامی کے رئیس کی حیثیت سے فرمایا ہے نہ کہ رسولؐ کی حیثیت سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایسے مسلمان کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہے۔

وكفّ عنهم، ثم ادعهم إلى التحوّل من دارهم إلى دار المهاجرين واعلمهم انّهم إن فعلوا ذالك ان لهم ما للمهاجرين وان عليهم ما على المهاجرين فان أبوا واختاروا دارهم فاعلمهم انّهم يكونون كاعراب المسلمين يجري عليهم حكم الله الذي كان يجري على المؤمنين ولا يكون لهم في الفيء والغنيمة نصيبٌ الا أن يجاهد وامع المسلمين (باب في دعاء المشركين)

ان کو پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا۔ اگر وہ قبول کر لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا۔ پھر ان سے کہنا کہ اپنے دار کو چھوڑ کر مہاجرین کے دار یعنی دار الاسلام میں آجائیں اور انہیں بتا دینا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اور وہی واجبات ان پر عائد ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی دار میں رہنا اختیار کریں تو انہیں آگاہ کر دینا کہ ان کی حیثیت اعراب مسلمین کی سی ہو گی ان پر اللہ کے وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو مومنین پر جاری ہوتے ہیں مگر فے اور غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ اِلّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔

ان آیات و احادیث فقہاء حنفیہ نے جو احکام مستنبط کیے ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ دار الاسلام کے مسلمان

جو نفوس و اموال دار الاسلام[1] کی حدود میں ہوں صرف انہی کی حفاظت حکومت

---

[1] ابتدائی زمانہ میں جب تمام اسلامی مقبوضات ایک ہی حکومت کے ماتحت تھے تو دار الاسلام خلیفۂ اسلام کے حدودِ سلطنت کا ہم معنی تھا۔ مگر اسلام کے دستوری (باقی ص ۳۳۵ پر)

اسلامی کے ذمہ ہے۔ اور جو مسلمان دارالاسلام کی رعایا ہوں دینی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ دنیوی حیثیت سے بھی اسلام کے تمام قوانین ان پر نافذ ہوں گے اور وہی کلی طور پر احکام کے ملتزم ہوں گے۔ یہ قاعدہ اسلامی قانون کے قواعد کلیہ میں سے ہے اور اس پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

(۱) اسی قاعدہ کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ عصمتِ نفوس و اموال و اَعراض صرف انہی مسلمانوں کی عصمت محض دینی عصمت ہے، عصمت مقومہ نہیں ہے جس کی بنا پر قضا شرعی لازم آتی ہے کما قال السرخسی فی کتابہ المبسوط العصمۃ المقومۃ تکون بالاحراز (جلد ۱۰،ص ۳۰) والعصمۃ بالاحراز بدار الاسلام لا بالدین (ایضاً ص ۵۳)

بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵ سے) قانون کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے وہ ایسے ہیں کہ جب دارالاسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو خود بخود دولت مشترکہ (Comman wealth) کا تصور پیدا ہو گیا ہر اسلامی مقبوضہ خواہ وہ دنیا کے کسی حکمران کے ماتحت ہو، بہر حال دارالاسلام کا ایک جزو ہے۔ اور ہر مسلمان خواہ وہ کہیں پیدا ہوا ہو، دارالاسلام میں داخل ہوتے ہی خود بخود اس کی رعیت بن جاتا ہے اور تمام حقوق شہریت (Rights of citizenship) اس کو حاصل ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس نے کسی دارالکفر کے ساتھ رعایا ہونے کا تعلق نہ جوڑ رکھا ہو۔ موجودہ اسلامی حکومتیں خواہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں، لیکن اسلامی قانون کی رُو سے کوئی مسلمان کسی اسلامی حکومت میں غیر ملکی نہیں ہے۔ ایک افغان کے حقوق اور واجبات ترکی اور ایران میں بھی وہی ہونے چاہئیں جو خود افغانستان میں ہیں اور ایک مسلمان کے لیے یہ ہرگز ضروری نہ ہونا چاہیئے کہ اگر وہ ایک اسلامی حکومت کے حدود سے نکل کر دوسری اسلامی حکومت کے حدود میں آباد ہو تو وہاں کی رعیت بننے کے لیے کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرے۔ ہر مسلمان دارالاسلام کا پیدائشی شہری ہے۔

(۲) اسی قاعدہ سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اسلامی قانون افعال کو حرام قرار دیتا ہے ان سے دارالاسلام کے مسلمان دیناً وقضاءً دونوں حیثیتوں سے روکے جائیں گے، مگر جو مسلمان دارالاسلام میں نہیں ہیں ان کا معاملہ ان کے اور خدا کے درمیان ہے، دین کا احترام دل میں ہو تو باز رہیں اور نہ ہو تو جو چاہیں کریں، اس لیے کہ اسلام کو ان پر نفاذِ احکام کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

(۳) یہی قاعدہ اس مسئلہ کا ماخذ بھی ہے کہ جو نفوس و اموال دارالاسلام کی حفاظت میں ہوں وہ سب معصوم ہیں اس لیے ان پر حق شرعی کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے تعدی کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ اس بارے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ تعدی کرنے سے ہر اس شخص کو روکا جائے گا جو احکام اسلام کا تابع ہو چکا ہو عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اور ہر اُس شخص کی جان و مال کی حفاظت کی جائے جو دارالاسلام کی حفاظت میں ہو خواہ مسلمان ہو یا کافر۔ لان الدین مانع لمن یعتقدہ حقا للشرع دون من لا یعتقدہ وبقوۃ الدار یمنع عن مالہ من یعتقد حرمتہ ومن لم یعتقدہ (المبسوط ج۱۴ ص ۵۸) اسی بنا پر دارالاسلام میں کوئی مسلمان مسلمان سے، اور کوئی مسلمان ذمی سے، اور کوئی ذمی مسلمان سے اور کوئی ذمی ذمی سے اور کوئی حربی مستامن دوسرے مستامن سے سُود پر یا عقود فاسدہ میں سے کسی عقد فاسدہ پر معاملہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ سب کے اموال سب کے لیے معصوم ہیں اور ان کو صرف اُنہی طریقوں سے لیا جا سکتا ہے جو اسلامی قانون میں جائز ہیں۔ فَإِنْ دَخَلَ تجارُ اهل الحَرْبِ دارَ الاسلام بِامَانٍ فَاشْتَرَى اَحَدُهم مِنْ صاحِبِه دِرْهَمًا بدِرهمين لم اجز ذالك الا ما اجیزہ بین اهلِ الإسلام وكذالك اهل الذّمة اذا فعلوا ذالك لان مال كل واحد منهم مَعْصُوم متقوم (المبسوط ج۱۴ ص ۵۸) اسی طرح اگر دارالکفر سے کوئی کافر دارالاسلام میں آئے یا دارالحرب سے کوئی حربی کافر امان لے کر اسلامی ملک میں داخل ہو تو اس سے بھی سُود لینا یا عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ حکومت اسلامی کی امان نے اس کو معصوم الدم و مال کر

گیا۔ اس صورت میں بھی امام مالک، امام احمد اور ہمارے ائمہ ابو حنیفہؒ وغیرہ رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے۔

اِذَا غَلَبُوْا عَلٰی اَمْوَالِنَا وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ وَاَحْرَزُوْھَا بِدَارِھِمْ مَلَکُوْھَا۔ (ھدایہ)

اور اگر کفار ہمارے یعنی مسلمانوں کے مال پر بھی خدانخواستہ قابو پالیں اور اس کو اپنے ملک میں لے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

پس یہی نہیں کہ غیر مسلم ایسی صورت میں صرف غیر مسلم ہی کے مملوکات کا جائز اور صحیح مالک ہو جاتا ہے، بلکہ اگر کافر کو مسلمان کے مالوں پر بھی اس طرح کامل قبضہ حاصل ہو جائے تو اسلام اس ملک کی بھی تصحیح کر سکتا ہے اور کافر کو اس مال کا مالک جائز قرار دیتا ہے۔ کیا یہی اسلام کی ناروا داری ہے؟

اموالِ معصومہ و غیر معصومہ اور ان کی اباحت و عدمِ اباحت

چونکہ ثانی الذکر مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو دوسرے ائمہ سے اختلاف ہے اس لیے فقہا نے قرآن و حدیث اور مختلف اسلامی مستندات سے اس قانون کے خالص اسلامی قانون ہونے کے نہایت واضح ثبوت پیش کیے ہیں۔ لیکن مضمون طویل ہو تا جاتا ہے اس لیے اس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس موقع پر صرف اس قانونی تنقیح کو پیش کرتا ہوں جس کو قرآن و حدیث سے حاصل کیا گیا ہے:۔

اِنَّ الْاِسْتِیْلَاءَ وَرَدَ عَلٰی مَالٍ مُّبَاحٍ فَیَصِیْرُ سَبَبًا لِّلْمِلْکِ۔

(ھدایہ۔ص ۲۵۵)

جائز اور مباح مال پر کفار کا قبضہ ہوا ہے اس لیے یہ قبضہ ملک کا سبب بن جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا مال مسلمان کے لیے تو بلاشبہ معصوم اور محفوظ ہے، ہر مسلمان ذمہ دار ہے کہ دوسرے مسلمان کے مال کو بلاوجہ نہ لے۔ لیکن غیر قوموں پر یہ

قانون عائد نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو یہ مباح ہوگا۔ چنانچہ شامی میں ہے :۔

لِاَنَّ الْعِصْمَۃَ مِنْ جُمْلَۃِ الْاَحْکَامِ الْمَشْرُوْعَۃِ وَھُمْ لَمْ یُخَاطِبُوْا بِھَا فَبَقِیَ فِیْ حَقِّھِمْ مَالًا غَیْرَ مَعْصُوْمٍ اَیْ ھُوَ مُبَاحٌ یَمْلِکُوْنَہٗ (ج ۳۔ ص ۲۶۷)

کیونکہ عصمت تو ایک اسلامی قانون ہے۔ غیر اسلامی ملک کے باشندے اس قانون کے محکوم نہیں ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا مال ان کے حق میں معصوم نہیں ہے، یعنی وہ ان کے لیے جائز اور مباح ہے پس وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

اب قدرتی طور پر تیسری صورت سامنے آجاتی ہے کہ اسی طرح اگر کسی مسلمان نے غیر مسلم مقبوضات و مملوکات پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک ہوگا یا نہیں؟ اس بین الاقوامی قانون کے اصول سے اس کا جواب بالکل ظاہر ہے۔ جب غیر مسلم مسلمان کے مال کا مالک ہو جاتا ہے تو آخر مسلم کو بھی یہ حق مذہبًا و دینًا و اخلاقًا و قانونًا کیوں نہ دیا جائے گا؟ بدائع میں ہے :۔

مَالُ الْحَرْبِیِّ مُبَاحٌ لِاَنَّہٗ لَا عِصْمَۃَ لِمَالِ الْحَرْبِیِّ۔

(ص ۱۳۲ کاسانی)

یعنی غیر مسلم جس کی جان و مال کی ذمہ دار کوئی اسلامی حکومت نہیں ہے اس کا مال مباح ہے کیونکہ ایسے غیر مسلم کا مال معصوم نہیں ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جن قوموں نے اپنی جان و مال کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد نہیں کی ہے، اسلام کی حفاظت اور ذمہ داری سے جنہیں انکار ہے، اگر اسلام بھی ان کی ذمہ داریوں سے انکار نہ کرے تو آخر وہ کیا کرے؟ تم اگر خدا سے برأت کا اعلان کرتے ہو تو خدا بھی تمہاری جان و مال کی ذمہ داری سے برأت کا اظہار کیوں نہ کرے! اس لیے قرآن پاک میں ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

شرک کرنے والوں سے خدا بری ہے۔

اس کے سوا کوئی اور صورت کیا ہو سکتی تھی؟ جب دنیا کی تمام قومیں موقع اور قوت پا کر مسلمانوں کی جان و مال اور مملوکات پر قبضہ کر لیتی ہیں جیسا کہ قرآن کا خود بیان ہے کہ:۔

وَإِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ۔ (الممتحنہ)

اگر تم پر ان کو قابو مل جائے تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں (اپنے ہاتھ چھوڑیں، زبان سے بُرائی پہنچائیں، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی خدا کے ناشکرے بن جاؤ۔

تو کیا اس قرآنی اور واقعی حقیقت کے بعد یہ ظلم نہ ہوتا اگر مسلمانوں کا مذہب ان کو بھی اس کی اجازت نہ دیتا! قرآن نے اگر اس کے بعد یہ حکم دیا ہے کہ:۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ۔ (الآیۃ)

مقاتلہ کرو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے حرام کیا اور نہ سچے آئین اور دین کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی۔

تو کیا اس کا مفاد اس کلیہ سے زائد ہے جو ابھی اسلامی فقہا کی تنقیح میں گزر چکا۔ یعنی مسلمانوں کا مال، مسلمانوں کے مملوکات جس طرح غیر مسلم اقوام کے لیے خود اسلامی قانون کی رو سے مباح ہیں اسی طرح وہ اور ان کے اموال بھی اللہ اور اس کے رسول ؐ کی شریعت اور قانون کی رُو سے مباح اور حلال ہیں۔ اگر مسلمان اس پر قبضہ کر لیں گے تو اس کے صحیح مالک اور ہر قسم کے تصرفات

مجاز و مختار ہوں گے۔[1]

---

[1] یہ خیال کرنا کہ برأت اور مقاتلہ کا حکم صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے جو قتالی اور محاربی ہیں، لیکن جو غیر مسلم قوم مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتی اور نہ ان کی ذمّی ہے اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ قرآن اور حدیث سے جہل کا نتیجہ یہ ہے۔ آخر یعدکم احدی الطائفتین میں خدا نے غیر محاربی قافلۂ تجار کا بھی وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ صحابہ کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اگر ایسا کرنا حرام تھا تو قرآن کو ٹوکنا چاہیئے تھا۔ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں بھی ابو بصیر صحابی اور ان کے رفقاء کا گزر صرف تجارتی قافلہ کے اموال غیر معصوم پر ہوا تھا۔ حضرت ابو ذرؓ بھی ایک زمانہ میں یہی کھاتے تھے۔ بہر حال قتالی ہو یا غیر قتالی، امیر کا اذن ہو یا نہ ہو، غیر ذمّی کفار مباح الدم والاموال ہیں۔ ابو بکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

وَلَا نَعْلَمُ اَحَدًا مِنَ الْفُقَهَاءِ يَحْظُرُ (يمنع) قِتَالَ مَنِ اعْتَزَلَ قِتَالَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَيُّمَا قَرْيَةٍ اتيتموها فاقمتم فيها وايما قَرْيَةٍ عَصَتِ اللّٰه ورسوله فان خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ۔ اس کی شرح میں عیاض لکھتے ہیں۔ اَنَّ الْمُرَادَ بِالْقَرْيَةِ الاولى هِيَ الَّتِيْ لَمْ يُوْجِفْ عَلَيْهَا الْمُسْلِمُوْنَ بِخَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ بَلْ اجلى عنها اهلها وصالحوا فيكون سهمهم فيها كما تقرر فى الفئ۔ ۱۲ سبل السلام بفاضل گیلانی۔

حاشیہ از مودودی۔ یہاں مولانا سے بڑی چوک ہوئی کہ انہوں نے محارب (Lellic...) اور غیر محارب (None-Belliverant) (...urtant) کے فرق کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ محارب وہ قوم ہے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہو۔ ایسی قوم کا کوئی فرد یا گروہ بالفعل مقاتل (Combatant) ہو یا نہ ہو، بہر حال اس کا مال مباح ہے۔ ہم اس کے تجارتی قافلوں کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ اس کے افراد ہماری زد میں آئیں گے تو ہم ان کو پکڑ لیں گے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیں گے۔ مولانا نے جتنی مثالیں پیش کی ہیں وہ سب اسی قبیل (باقی ص ۲۴۲ پر)

عود الی المقصود

بہرحال اصلی بحث یہ تھی کہ غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل کیا ہونا چاہیئے اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی۔ بیچ میں ایک مسئلہ کا ذکر آگیا۔ بات تو بہت عام تھی لیکن تصحیح خیالات کے لیے مجھے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۱) کی ہیں۔ لیکن جو قوم ہم سے برسرِ جنگ نہیں ہے، وہ خواہ معاہد ہو یا نہ ہو اس کے اموال ہمارے لیے مباح نہیں ہیں۔ قرآن میں تصریح ہے کہ لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ (الممتحنہ۔ ۸) یہ بات عین مقتضائے عقل و انصاف ہے۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے لیے مطلقاً ہر غیر ذمی کافر کا مال مباح ہو، جیسا کہ مولانا کے بیان سے ظاہر ہو رہا ہے، تو مسلمانوں کی قوم اقوام عالم کے درمیان امت وسط ہونے کے بجائے ایک لیٹری قوم بن جائے گی، غیر قوموں پر ڈاکے مارنا اس کا پیشہ قرار پائے گا اور دنیا میں اس کا وجود ایک بلائے عام بن جائے گا۔ رہا یہ سوال کہ جب غیر مسلم مسلمانوں کے مال پر ظالمانہ قبضہ کرکے اس کا مالک ہو سکتا ہے تو مسلم بھی کیوں نہ اس کے مال پر قبضہ کرنے کا مجاز ہو، تو یہ بھی درحقیقت حالت جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ حالت امن میں اسلام اپنی رعایا کو دوسری غیر محارب قوموں پر ڈاکہ زنی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر دوسری قوم کے افراد مسلمانوں پر ڈاکہ زنی کی ابتدا کریں تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی اور اس وقت مسلمانوں کے لیے ان کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔ قرآن میں جہاں مشرکین سے اعلان برا ءت کیا گیا ہے وہاں صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (یعنی ظلم کی ابتدا ان کی طرف سے ہوئی تھی) پس مسلمان اپنی طرف سے سلب و نہب کی ابتدا نہ کریں گے۔ بلکہ جب ابتداء دوسروں کی طرف سے ہوگی تو وہ معاہدہ کی صورت میں فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ پر پہلے سے معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں اعلانِ جنگ پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد تمام قوم حربی قرار پائے گی اور اس کے اموال اور خون مباح ہو جائیں گے۔

اصل بحث سے تھوڑی دیر کے لیے دُور جانا پڑا۔ اب میں پھر اپنے اصلی مدعا کی طرف آتا ہوں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ "مستامن مسلمان" کے لیے فرض ہے کہ جس غیر اسلامی حکومت میں وہ امن کی ضمانت لے کر داخل ہوا ہے وہاں کے مروجہ قوانین کی سختی سے پابندی کرے۔ کسی کے مال وجان، عزت و آبرو پر حملہ کر کے قانون وقت کو توڑنا غدر ہے۔ اور غدر قرآناً و حدیثاً و اجماعاً حرام ہے۔ الغرض قانون وقت کی پابندی اس کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قانون ملکی کے خلاف لفافہ میں نصف ماشہ کا بھی اضافہ یا ریل کے سامان میں پاؤ سیر کی زیادتی بھی اس کے لیے ناجائز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ امن پسند قوم مذہبی حیثیت سے کوئی نہیں ہو سکتی۔

لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ "اسلامی قانون" کی رُو سے ایک فعل ناجائز ہے۔ مثلاً یہی سُود کا مسئلہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی دوسرے مال لینا اسلام میں قطعاً حرام ہے، مگر غیر اسلامی قانون میں اس ذریعہ سے تحصیل مال کی اجازت ہے بلکہ حکومت بھی بڑے وسیع پیمانے پر مختلف صورتوں میں اس کا کاروبار کرتی ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان کو کیا کرنا چاہیئے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اگر وہ "مستامن مسلمان" اس ذریعہ سے اُس ملک کے غیر مسلم باشندے کا مال حاصل کرتا ہے تو نقض معاہدہ یا قانون شکنی یا غدر کا تو وہ قطعاً مرتکب نہیں ہے اور اس لحاظ سے مذہبی طور پر وہ قانون معاہدہ کا قطعاً مجرم نہیں۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ کیا اس نے کسی دوسرے سے ایسے مال کو حاصل کیا ہے جس کے لینے کا گو قانون ملکی نے اسے مجاز گردانا ہے لیکن مذہب یا خدا اس کے لینے سے روکتا ہے؟ یا یوں کہو کہ کیا اس نے ایسا مال حاصل کیا ہے جو قانوناً نہ سہی لیکن اسلام کی رُو سے وہ مباح نہ تھا بلکہ معصوم تھا؟ ابھی شریعت (اسلامی قانون) بلکہ قرآن سے گزر چکا ہے کہ اس قسم کا مال مسلمان کے لیے مذہباً غیر معصوم اور مباح[1] ہے۔ پھر ایک

---

[1] اگر مولانا کی اس تعبیر قانون کو مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان (باقی ص ۲۴۴ پر)

مسلمان کیا کرے؟ قرآن اور مذہب جس کو غیر معصوم اور مباح کہتا ہے کیا وہ اپنے مذہب سے روگردانی کر کے اس کو معصوم اور غیر مباح کہہ دے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس مال کو نہ قانون ناجائز قرار دیتا ہے اور نہ شریعت حرام قرار دیتی ہے بلکہ اس کے لینے کا حکم دیتی ہے، غریب مسلمان آخر اس جائز کو کس طرح ناجائز اور اس حلال کو کس طرح حرام کر دے؟ کیا وہ سلطنت کے قانون سے بغاوت کرے؟ یا شریعت کے حکم کو توڑے؟ کیا اس کے بعد مسلمان کے لیے کہیں بھی پناہ ہے؟

اسلامی قوانین کا یہی وہ اضطراری مقتضا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے سب سے محتاط، بلکہ بقول بعض عوام، سخت گیر امام، امام الائمہ، قدوۃ الاتقیاء قائم اللیل، التابعی المجتہد المطلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ نہایت بیّن اور غیر مبہم واضح لفظوں میں امام محمد رح نے "سیر کبیر" میں نقل فرمایا ہے۔

اِذَا دَخَلَ الْمُسْلِمُ دَارَ الْحَرْبِ بِاَمَانٍ فَلَا بَاْسَ بِاَنْ يَّاْخُذَ مِنْهُمْ اَمْوَالَهُمْ بِطِيْبِ اَنْفُسِهِمْ بِاَيِّ وَجْهٍ كَانَ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۳ سے) میں کسی غیر مسلم کے مال کو لوٹنے یا چرا لینے یا رشوت و خیانت کے ذریعہ سے لینے والا مسلمان صرف قانون ملکی کا مجرم ہو گا، اور مذہباً اگر اسے گناہ گار سمجھا جائے گا تو صرف اس بنا پر کہ اس نے قانون معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے نہ کہ اُن احکام اسلامی کی جن میں ان افعال کو بجائے خود حرام کیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی غیر مسلم حکومت میں کوئی مسلمان عورت العیاذ باللہ فحش کاری کا پیشہ اختیار کرے اور غیر مسلموں سے زنا کی اجرت لے تو ایسا مال بھی اس کے لیے حلال و طیب ہو گا کیونکہ جب غیر مسلم حکومت کا قانون اس کے اس پیشہ کو جائز رکھتا ہے اور اسے فاحشہ گری کا لائسنس دے دیتا ہے تو وہ قانونِ معاہدہ کی خلاف ورزی کی مجرم نہیں ہے، اور جب اسلامی شریعت غیر ذمّی کافر کے مال کو قرار دیتی ہے ——— خواہ کسی صورت سے اس مال کو لیا جائے ——— تو وہ شریعت کی رُو سے بھی حرام خوری کی مجرم نہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ مولانا اس نتیجہ کو نہ مانیں مگر ان کے طرزِ استدلال کا منطقی نتیجہ تو یہی ہے۔ (مودودی)

لِاَنَّہٗ اِنَّمَا اَخَذَ الْمُبَاحَ عَلٰی وَجْہٍ عَرِیَ عَنِ الْغَدْرِ فَیَکُوْنُ ذٰلِکَ طَیِّبًا لَّہٗ۔ (منقول از شامی ص۔۲۱ ج ۴ مطبوعہ مصر)

جب مسلمان دارالحرب[1] (غیر اسلامی ملک) میں امان کا معاہدہ کر کے داخل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں کے باشندوں

---

[1] دارالحرب سے مراد دراصل ایسا ملک ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو جس سے سلطنت اسلامی کی مسلم رعایا کے افراد حالت جنگ میں بطور خود امان (Safe Conduct) of Trade Liciencist) ——— لے کر غیر معاندانہ کاروبار ——— (Non-Hostile) ——— کے لیے جائیں ——— حنفی قانون کی اس دفعہ کو ایسے دارالکفر پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا جہاں مسلمانوں کی ایک قوم محارب مستامن کی حیثیت سے نہیں بلکہ رعایا کی حیثیت سے آباد ہو اور اسے اپنی حد تک اپنے پرسنل لاء کی پابندی کا حق بھی حاصل ہو۔ مولانا کے نظریہ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ہر غیر ذمی کافر کو حربی (Enemy) اور ہر غیر مسلم مقبوضہ کو دارالحرب (Enemy Country) سمجھ رہے ہیں۔ یہ اسلام کے بین الاقوامی قانون کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ غیر مسلم کا مال اور خون صرف حالت جنگ میں مباح ہے، اور وہ بھی اسلامی سلطنت کے لیے نہ کہ خود اس غیر مسلم سلطنت کی مسلم رعایا کے لیے جس کو آپ حربی قرار دے رہے ہیں۔ حنفی قانون کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ جب کوئی مسلمان دشمن کے ملک میں امان لے کر جائے تو وہاں وہ عقود فاسدہ پر بیع و شرا کر سکتا ہے۔ یہ اجازت دو وجوہ پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ دشمن کا مال فی الاصل مباح ہے۔ جب اس کو بجبر چھین لیا جا سکتا ہے تو عقد فاسد کے ذریعہ سے حاصل کرنا تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جنگ کی حالت ایک اضطراری حالت ہے اور اضطرار میں حرام حلال ہو جاتا ہے۔

(مودودیؒ)

(غیر مسلم) کی مرضی سے ان کا مال لے خواہ ذریعہ کوئی بھی ہو[۱] کیونکہ اس
نے ایک مباح مال کو لیا ہے اور ایسے ذریعہ سے لیا ہے جو قانون شکنی
(غدر) سے پاک ہے تو یہ مال اس کے لیے پاک اور طیب ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فتوے اس عہد تاریک کا نہیں ہے جس وقت مسلمان محکوم تھے۔ جس زمانہ میں امام رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت سے اس قانونی دفعہ کو پیدا کیا تھا غالباً اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی مسلمانوں کے اعمال و افعال عقائد و رسوم کی وہ "زشتی" نہ تھی جو "نادر یورپ" کی صورت میں یکایک[۲] ظاہر ہو گئی۔ یہاں تک عباد صالحین

---

[۱] ان الفاظ کی عمومیت محلِ نظر ہے۔ اگرچہ امام محمدؒ ہی نے یہ لکھا ہو، مگر اس کو بلا کسی قید و شرط کے نہیں مانا جا سکتا، ورنہ جائز ہو گا کہ مسلمان دار الحرب میں جا کر شراب فروشی شروع کر دے یا قحبہ خانہ کھول دے یا کوئی مسلمان عورت قحبہ گری کا پیشہ کرنے لگے۔ (مودودی)

[۲] غالباً امام ابو حنیفہ رح کے حاشیہ خیال میں یہ بات بھی نہ تھی کہ جو حکم انہوں نے دشمن کے ملک میں امان لے کر جانے والے مسلمان تاجروں یا سیاحوں کے لیے بیان کیا تھا اس کو غیر اسلامی مقبوضات میں مستقلاً رہنے والے اُن کروڑوں مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے گا جو غیر مسلم حکومت کے ماتحت اتنی آزادی ضرور رکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشی و تمدنی احکام کی پابندی کر سکیں۔ امام صاحب نے جو قانون بیان فرمایا ہے وہ صرف ایسے دار الحرب (بر سر جنگ علاقے) کے متعلق ہے جس میں دار الاسلام کا کوئی مسلمان کار و بار کے لیے امان لے کر جائے۔ ان کا یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ مسلمان جہاں غیر مسلم حکومت کے تحت ایک کثیر تعداد میں مستقل بود و باش رکھتے ہیں وہاں وہ اسلام کے معاشی قانون سے آزاد ہیں۔ اور جن مالی معاملات کو اسلام نے حرام کیا ہے وہ سب وہاں کیے جا سکتے ہیں۔ ایسی جگہ تو مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نہ صرف غیر اسلامی معیشت سے بچیں بلکہ اپنی پوری اجتماعی قوت اس نظام کو بدلنے اور اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کرنے میں صرف کریں۔ لیکن مولانا جس طریق پر اسلامی قانون کی تعبیر فرما رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کے کئی کروڑ مسلمان اپنی قومی (باقی ص ۲۴۷ پر)

نے قوم عابدین کو عبادت کے کٹہرے کی طرف بھگانے کے لیے اپنی میراثوں میں، غوثی و قطبی میراثوں میں، ان شیروں کو کچھاروں سے چھوڑ دیا جو سب پر رحم کر سکتے ہیں، لیکن جن کا فریضہ عبادت تھا ان کے پاس ان کے لیے کوئی رحم نہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ فقہاء جب اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کسی اسلامی مقبوضہ پر فرض کرو کہ غیر اسلامی حکومت قابض ہو جائے تو بطور جملہ معترضہ کے "عیاذاً باللہ" کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اس مفروضہ کو بھی وہ فرض کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام اعظم نے کسی وقتی ضرورت کے آگے نہیں بلکہ کتنی شریعت کی مجبوریوں کے آگے گردن جھکا دی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس فتویٰ کی عملی تصدیق صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ جس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم و ایران کی باہمی آویزشوں کے زمانہ میں قرآن مجید کی پیش گوئی پر اصرار کرتے ہوئے ایک غیر اسلامی ملک یعنی مکہ مکرمہ میں (جو اس وقت حکومت اسلامیہ کے تحت نہ تھا) قریش سے یہ شرط لگائی کہ قرآن ہی کی پیش گوئی پوری ہو گی۔ تو جب وہ پوری ہوئی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے اونٹ لینے کا حکم دیا اور یہ اونٹ وارثوں سے وصول کیے گئے (ترمذی) فقہاء اسلام اس عمل سے اس قانون کی توثیق کرتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی "شرط" صریح قمار (جُوا) ہے جس کی حرمت قطعی نصوص سے ثابت ہے[1]

بقیہ حاشیہ ص ۲۴۶ سے) طاقت کو ملک کے معاشی و تمدنی نظام کی اصلاح پر صرف کرنے کے بجائے خود اس فاسد نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔ (مودودی)

[1] ترمذی میں تصریح ہے کہ یہ شرط اس زمانہ میں ہوئی تھی جب تحریم رہان (شرط بدنے کی حرمت) کا حکم نہیں ہوا تھا۔ تفسیر ابن جریر میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے۔ پھر تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو بکر رض نے اس شرط کا مال اُبی بن خلف کے (باقی حاشیہ ص ۲۴۸ پر)

دارالحرب میں سود حلال نہیں بلکہ فے حلال ہے

لوگوں میں یہ عجیب بات مشہور ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں سود حلال ہو جاتا ہے، اور زیادہ تر اصل مسئلہ کے سمجھنے میں یہی تعبیر مانع آتی ہے۔ ورنہ مسئلہ کی بنیاد جس قرآنی قانون پر ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ جو چیز حرام تھی وہ کسی وقت حلال ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو چیز ہمیشہ سے حلال تھی وہی حلال ہوئی۔ خدا جس چیز کو حلالاً طیباً فرماتا ہے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی کو طیب فرماتے ہیں، ورنہ ایک مسلمان کو اس کا کیا حق ہے کہ قرآن جس چیز کو حرام کرے اسے وہ اپنی رائے سے یا کسی معمولی ظنی خبر کی بنیاد پر حلال کر دے۔ خصوصاً وہ جو واحد خبروں سے نص پر اضافہ کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ علاوہ اسی وجہ کہ ان (قانون وقت کے جس جائز کردہ ذریعہ سے بھی وہ مال ملتا ہو) کی عمومیت کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سود ہی کو نہیں بلکہ قمار (جوا) کے اُن ذرائع سے بھی تحصیل مال کو طیب قرار دیا ہے جس کی قانون وقت میں ممانعت نہ ہو۔ مثلاً یہی بیمہ ہے یا لائف انشورنس کا ذریعہ[1] ہے علماء اسلام کے نزدیک قمار اور سود کی یہ مرکب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۷ سے) ورثاء سے وصول کیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے صدقہ کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مال مکروہ تھا، دشمن سے لے لیا گیا مگر اسے خود اپنے استعمال میں لانا پسند نہ کیا گیا۔ (مودودی)

[1] دارالحرب جو احکام فقہ حنفی میں حالتِ جنگ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ہندوستان پر چسپاں کر کے مولانا سخت غلطی کر رہے ہیں۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہندوستان میں جوئے اور سٹے اور لاٹری اور ریس کے ذریعہ سے بھی مسلمان روپیہ کما سکتے ہیں اور یہ مال ان کے لیے طیب ہے۔ اگر اسی پر فتویٰ ہو جائے تو معاشی حیثیت سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں قطعاً کوئی فرق نہ رہے گا اور جہاں تک معاشی زندگی کا تعلق ہے، تمام مسلمانانِ ہند غیر مسلم ہو جائیں گے۔ اصلی غلطی یہ ہے کہ مولانا ہر اس غیر مسلم کے مال کو مباح سمجھ رہے ہیں (باقی ص ۲۴۹ پر)

شکل ہے، لیکن سیر کبیر میں امام محمدؒ امام اعظمؒ سے ناقل ہیں۔

اَوْ اَخَذَ مَالَہُمْ مِنْہُمْ بِطَرِیْقِ الْقِمَارِ فَذٰلِکَ کُلُّہٗ طَیِّبٌ ،

اگر ان سے (غیر مسلموں سے) جوئے کے ذریعہ سے مال لے گا تو

یہ سب اس کے لیے پاک اور طیب ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۸ سے) جس کی ذمہ داری کسی اسلامی حکومت نے نہ لی ہو۔ حالانکہ اس نظریہ کی تائید قرآن و حدیث کے کسی حکم سے نہیں ہوتی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ایسے دارالکفر کو جو اسلامی اصطلاح کی رُو سے درحقیقت دارالحرب نہیں ہے، دارالحرب قرار دے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف سُوءِ تعبیر ہے بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے مہلک بھی ہے۔ ہندوستان اس وقت بلاشبہ دارالحرب تھا جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض تھا کہ یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جانیں لڑا دیتے، یا اس میں ناکام ہونے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے۔ لیکن جب وہ مغلوب ہو گئے، انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول کر لیا تو اب یہ ملک دارالحرب نہیں رہا۔ بلکہ ایک ایسا دارالکفر ہو گیا جس میں مسلمان رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں اور قانون ملکی کے مقرر کیے ہوئے حدود میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی رکھتے ہیں ایسے ملک کو دارالحرب ٹھہرانا اور ان رخصتوں کو نافذ کرنا جو محض دارالحرب کی مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھ کر دی گئی ہیں، اصول قانون اسلامی کے قطعاً خلاف ہے، اور نہایت خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں اسلامی قوانین پر عمل درآمد کرنے کے جو تھوڑے بہت اختیارات حاصل ہیں ان سے بھی وہ خود بخود دست بردار ہو جائیں گے، شریعت کے جو رہے سہے حدود اس وقت ان کے قومی وجود کی حفاظت کر رہے ہیں، وہ بھی باقی نہ رہیں گے اور مسلمان غیر اسلامی نظام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔ انتہائی اضطرار کی حالت میں مسلمانوں کے ایسے منتشر افراد کو جن کی کوئی اجتماعی (باقی ص ۲۵۰ پر)

سُود کی شہرت کا سبب غالباً امام مکحول (جو محدثین کے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں) کی وہ مرسل حدیث ہے جو اسی مسئلہ کی تائید پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے:۔

عَنْ مَكْحُولٍ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

لَا رِبٰو بَيْنَ الْحَرْبِيِّ وَالْمُسْلِمِ۔ (اسنادۂ بیہقی)

مکحول سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حربی (غیر مسلم) اور مسلمان کے درمیان سود نہیں ہے۔

لوگ نہ معلوم اس کا مطلب کیا سمجھتے ہیں ورنہ ظاہر الفاظ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ مسلم اور غیر ذمی نا مسلمان کے درمیان اگر سُود کا معاملہ ہو تو وہ سُود، سُود ہی نہ ہوگا بلکہ "قرآنی قانون اباحت" کے تحت یہ مال مسلمان کے لیے طیب و حلال ہے۔

بہر حال اسلامی شریعت، قرآن و حدیث، عمل صحابہ کی رُو سے یہ ایک ایسا واضح اور صاف قانون ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگ مکحول کی حدیث مرسل کے متعلق حجیت و عدم حجیت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بس تو تائید میں

(بقیہ حاشیہ ۲۵۰) طاقت نہ ہو، اور جو معاندین کے درمیان گھرے ہوئے ہوں، اسلام اپنے قانون کی گرفت ڈھیلی کر کے چند رخصتیں عطا کرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ اس حالت میں قیام نہ کرو، بلکہ بعجلت ممکنہ دار الاسلام کی طرف واپس آجاؤ۔ مولانا ان رخصتوں کو ایسی قوم کے لیے عام کر رہے ہیں جو کئی کروڑ کی عظیم الشان تعداد میں ہے اور مستقل طور پر اس ملک میں متوطن ہے۔ دار الحرب کے احکام ایسی قوم کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔ اس کو تو نہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جن احکام اسلامی پر عمل کرنا ممکن ہو ان پر عمل کرے بلکہ اُسے دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کرنی چاہیئے۔ (مودودی)

پیش کی جاتی ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اموال کے طیب وحلال ہونے کا حکم تو قرآن کے نصوص صریحہ کی واضح عبارت کا نتیجہ ہے۔ علامہ ابن ہمام نے بالکل صحیح لکھا ہے :-

وَفِی التَّحْقِیقِ یَقْتَضِی اَنَّہٗ لَوْلَمْ یَرْوِ مَکْحُوْل اَجَازَہٗ
اَلنَّظَرُ الْمَذْکُوْرُ۔ (فتح القدیر ج ۷ ص ۱۷۸)

اور تحقیق کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر مکحول کی روایت نہ بھی وارد ہوتی تو مذکورۂ بالا "نظر" اس کی اجازت دیتی ہے۔

صاحب بدائع نے اسی بنیاد پر امام ابوحنیفہ رح کے مذہب کی صحیح تعبیر کی ہے :-

وَعَلٰی ھٰذَا اِذَا دَخَلَ مُسْلِمٌ اَوْذِمِّی دَارَالْحَرْبِ بِاَمَانٍ
فَعَاقَدَ حَرْبِیًّا عَقْدَ الرِّبٰوا اَوْغَیْرِہٖ مِنَ الْعُقُوْدِ الْفَاسِدَۃِ
فِی الْاِسْلَامِ جَازَ۔ (ص ۱۳۲ - ج ۷)

اور اس بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسلمان یا ذمی دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں امن کا معاہدہ کر کے داخل ہو اور کسی غیر مسلم سے ربٰو (سود) کا معاملہ کیا یا اس قسم کا کوئی معاملہ کیا جو اسلامی قانون کی رُو سے فاسد ہو تو وہ معاملہ جائز ہوگا۔

فئے اور بھاؤ کی اصطلاح

اور اسی لیے میرا ناچیز خیال ہے کہ اس قسم کی تمام "آمدنیاں" جو مسلمانوں کو غیر اسلامی حکومتوں میں قانوناً میسر آسکتی ہیں، ان کو بجائے سود یا قمار یا جوا وغیرہ کہنے کے مناسب ہوگا کہ اس کا خاص نام "فئے" رکھ دیا جائے جس کے معنی گویا یہ ہوں گے کہ وہ مال جو بغیر کسی حرب و قتال، جنگ و جدال کے دوسری اقوام سے امن پسندانہ طور پر قانون وقت کی پوری پابندی کے ساتھ مسلمانوں کو ملا[1] ——— مجھے ایسا

---

[1] شامی میں ہے :- وَمَا اَخَذَ مِنْهُمْ بِلَا حَرْبٍ وَلَا قَهْرٍ كَالْهَدِيَّةِ (باقی ص ۲۵۲ پر)

خیال آتا ہے کہ ہندی میں ایک لفظ "بھاؤ" کا ہے جو قریب قریب "فے" کا ہم پلہ بھی ہے، اور غالباً ایک حد تک اسی معنی کو ادا بھی کرتا ہے۔ خواص تو ان آمدنیوں کو اپنی "فے" کی آمدنی کہیں گے۔ عوام کی زبان پر (فے) نہ چڑھے گی تو وہ اس کو "بھاؤ" کہہ دیں گے۔ اس تعین اصطلاح ایک بڑی ضرورت وہ وجہ بھی ہے جو بعض ثقات اسلام کی جانب سے اس مسئلہ کے متعلق بطور اندیشہ یا خطرے کے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس مسئلہ کا اعلان کر دیا گیا تو ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد مسلمان اس کو بھول جائیں گے کہ سود، قمار اور از قبیل دوسرے ذرائع ان کی شریعت میں حرام بھی تھے یا نہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ان آمدنیوں کا نام "فے" رکھا جائے کہ اس لفظ سے مسلمانوں کو یہ یاد آتا رہے گا کہ غیر اقوام سے ان کے شرعی تعلقات کیا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱) والصلح فهو لا غنيمة ولا فيء وحكمه حكم الفيء (ص ۲۵)

اور جو کچھ ان سے بغیر جنگ اور زبردستی کے لیا جائے مثلاً خراج یا مال صلح، تو وہ نہ غنیمت ہے اور نہ فے بلکہ اس کا حکم فَی کا حکم ہے۔

فتح القدیر میں ہے :- فكان هذا اكتساب مباح من المباحات كالاحتطاب والاصطياد۔

یہ اکتساب مباحات میں ہوگا جیسے لکڑیاں چننا اور مچھلیاں پکڑنا۔

فے کی تعریف سبل السلام میں ہے :- هُوَ مَا حَصَلَ لِلْمُسْلِمِيْنَ مِنْ اَمْوَالِ الْكُفَّارِ مِنْ غَيْرِ حَرْبٍ وَلَا جِهَادٍ۔

وہ مال جو مسلمانوں کو کفار کے اموال میں سے بغیر جنگ و جہاد کے حاصل ہو۔ اور اراضی بنی نضیر کے متعلق خود قرآن میں ہے :- مَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ۔

جس پر تم نے دوڑ دھوپ نہ کی ہو نہ گھوڑوں سے نہ اونٹوں سے۔

تمام احادیث کی کتابیں معمور ہیں کہ اس فے کی آمدنی سے اہل بیت نبوت کے ذاتی مصارف پورے ہوتے تھے۔ (فاضل گیلانی)

ہیں اور غیر اسلامی حکومتوں کے معاہدۂ امن کی تکمیل ان پر شرعاً کس حد تک لازم ہے۔ آخر جن کاروباری معاملات سے خدا ناراض نہیں ہے، قانون خوش، حکومت خوش، دینے والے خوش، ان کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کس چیز سے ڈرنا چاہیئے۔

فَے سے انکار قومی جرم ہے

سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کے بچے کھچے سرمایہ دار، قلیل البضاعۃ اس حلال، بلکہ بالفاظ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ طیب آمدنی کو، جسے میں "فَے" یا "نپھاؤ" کہتا ہوں، اور جس کے متعلق قرآن کا صریح حکم حلالاً طیباً ہے، نہ لے کر قومی جرم اور قومی خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے سرمائے جو بینکوں میں محفوظ ہیں ان کے لاکھوں روپے کا "فَے" صرف یہی نہیں کہ غیر اسلامی قوتوں کی بالیدگی ہے، اور مسلمانوں کے لیے معاشی راہوں کے بدلنے سے ہر سال بیکار ہو جاتا ہے، بلکہ سنا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس "فَے" کی آمدنی سے مسلمانوں ہی کے بچوں، عورتوں اور غریبوں کو اسلام

ــه قرآن کی اصطلاح میں فَے صرف اس مال کو کہتے ہیں جو برسرِ جنگ قوم سے بغیر قتال کے حاصل ہو۔ سورۂ حشر پڑھ جائیے۔ تمام ذکر حالتِ جنگ کا ہے۔ بنی نضیر پر چڑھائی کی گئی۔ کارزار کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ مرعوب ہو گئے اور انہوں نے جلاوطن ہونا قبول کیا۔ اس موقع پر جو اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آئے ان کو فَے کہا گیا۔ یہ اصطلاح اُن اموال پر کیوں کر چسپاں ہو سکتی ہے جو حالتِ امن میں غیر محارب کافروں سے سُود اور قمار بازاری اور سٹے اور دوسرے غیر اسلامی طریقوں سے حاصل کی جائے۔ پھر اگر یہ فَے ہو بھی، تو افرادِ امت فرداً فرداً اُس کو کیسے کھا سکتے ہیں۔ اموالِ فَے کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ وہ حکومت کے خزانے میں داخل کیے جائیں اور ان کو عام مصالحِ اسلامی پر صرف کیا جائے۔ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الحشر)

(مودودی)

چھڑا چھڑا کر محمدؐ رسول اللہ کی صف سے توڑ توڑ کر غیروں کی صف میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ کھلے بندوں يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ یہ اپنی قوم کے ساتھ غداری نہیں تو اور کیا ہے؟[1] ہائے مسلمانوں ہی کی چاندی کی چھری سے مسلمانوں کا ذبح کرنا کس نے جائز قرار دیا! کیا خدا نہیں دیکھ رہا ہے! امام الدنیا والدین رسول رب العالمین خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبریں نہیں پہنچ رہی ہوں گی! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دنیا والو! دیکھو! سُود کے جالوں میں پھنسا کر پورب، پچھم، اُتر، دکھن، کے لوگ دل کھول کر شکار کر رہے ہیں۔ سُود دو، یا کھیت دو، یا جائداد دو، یا مکان دو، یا عرب کے اُمی لقب صلی اللہ علیہ وسلم کا آستانہ چھوڑ دو، ان مہروں کی شطرنج پر کیسی دردناک بازیاں کھیلی جا رہی ہیں۔

بینک کا سُود

سچ یہ ہے کہ بینک زیادہ تر سُود خوروں کی باضابطہ کمیٹیوں کا نام ہے۔ لیکن جب اس کا تنظیمی و اختیاری عملہ وہ نہیں ہوتا جن سے مسلمانوں کو روکا نہیں گیا ہے تو اب اس کمیٹی کی ممبری یا رکنیت نہیں ہے، بلکہ اس کمپنی سے معاملہ ہے جو لوگوں کو سُود پر قرض دیتی ہے! کن سے سُود لیتی ہے؟ یہ اس کا اپنا معاملہ اور جدید عقد ہے جس سے اُس معاملہ کو قطعاً نسبت نہیں جو ایک مسلمان نے ارباب بینک سے کیا ہے،

---

[1] محتاط علماء نے اسی خیال سے کہ سُود کی رقم بینک میں چھوڑ دینا کفار کے لیے موجب تقویت ہو جائے گا، یہ فتویٰ دیا ہے کہ سود بینک سے لے کر غریب مسلمانوں پر صدقہ کر دیا جائے یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کسی کام پر خرچ کر دیا جائے یہ فتویٰ نہایت درست ہے۔ فقہ میں مال محظور کے متعلق یہ مسئلہ موجود ہے کہ اگر غلطی سے ایسا مال لے لیا گیا ہو یا مجبوراً کسی مصلحت سے لینا پڑا ہو، تو اس کو صدقہ کر دینا چاہیئے۔ پس جو نقصان مولانا فرما رہے ہیں اس سے بچنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ سُود کو سَے قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

(مودُودی)

بلکہ بین الملی قوانین کے جو دفعات آئین اسلامی سے گزر چکے ان کو سامنے کے بعد بینک والوں کے سارے کاروبار جس کسی سے ہوں صحیح ہو جاتے ہیں[1] فلیتدابر۔

ہاں میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ جو ایسا کرتے ہیں وہ وطن کی پاسبانی نہیں کر رہے ہیں۔ وطن والوں کے ساتھ، وطن کے مزدوروں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن جو وطن کا محافظ ہے، جس حکومت کو وطن کے باشندوں کی نگرانی سپرد کی گئی ہے، جب وہی ان معاملات کو وطن کی بہبودی اور ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے اور خود وطن والے بھی ایسا ہی

---

[1] بینک کے سود میں کراہت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہم جو رقم بینک میں رکھواتے ہیں اس کو بینک والے منجملہ اور معاملات کے سودی قرض کے کاروبار میں بھی لگاتے ہیں، اور جن لوگوں کو یہ سودی قرض دیا جاتا ہے اور ان میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح جو سود ہم کو بینک سے وصول ہوتا ہے وہ صرف غیر مسلموں ہی کی جیب سے نہیں آتا بلکہ مسلمانوں کی بھی جیب سے آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم مسلمان براہ راست سود نہیں کھاتے بلکہ بینک کے واسطے سے کھاتے ہیں۔ مولانا اس اعتراض کو یہ کہہ کر دفع فرماتے ہیں کہ "حربی" بینکر نے خود ہماری امانت کے روپے میں سے جب کسی مسلمان کو قرض دیا اور اس پر سود وصول کیا تو یہ سود کی رقم جائز طور پر اس کی ملک ہو گئی۔ اب اس کے بعد جب ہم نے اس سے اپنی امانت پر سود وصول کیا تو یہ سود کی رقم جائز طور پر اس کی ملک ہو گئی۔ اب اس کے بعد جب ہم نے اس سے اپنی امانت پر سود وصول کیا تو گویا ہم نے "حربی" کے مال پر (جو ہمارے لیے مباح اور حلال وطیب ہے) قبضہ کیا۔ اب یہ سوال باقی رہ گیا کہ جب یہ کافر حربی خود ہمارے دیئے ہوئے ہتھیار سے مسلمانوں کو ذبح کرتا ہے، اور پھر ان کے گوشت میں سے ہم کو بھی حصّہ دیتا ہے، تو ہم اپنا ہتھیار اس کو دیں ہی کیوں؟ مولانا نے اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

(مودودی)

سمجھتے ہیں تو مسلمان وطن کی وفاداری میں کیا اپنی قوم سے غداری کریں؟ حالانکہ وطن تو وطن ان پر تو خاندانی حقوق کے سلسلہ میں بھی قومی غداری حرام ہے۔ قرآن کا علم اعلان ہے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (الممتحنہ ۳)

تمہارے رشتے اور تمہارے بچے قیامت کے دن کام نہیں آئیں گے۔ خدا تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں صبر کا حکم دیا گیا ہے اور خاص وقت تک صبر ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ لیکن کیا قانونِ صبر کے ساتھ "مجازاۃ بالمثل" کی بھی قرآن ہی نے تعلیم نہیں دی ہے؟

فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔ النحل ۱۲۶

اگر تم پر زیادتی کی جائے تو تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو جتنی تم پر کی گئی اور صبر کرو گے تو صبر کرنے والوں کے لیے یہی بہتر ہے۔

لیکن صبر کی کوئی نہایت بھی ہے؟ استقلال کی کوئی حد بھی ہے؟ جس نے صبر سکھایا اسی نے تو

لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ البقرۃ ۱۹۵

اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو!

لہ اس مسئلہ میں وطن کی وفاداری یا قوم کی غداری کا قطعاً کوئی سوال نہیں۔ اہل ایمان صرف اس بنا پر سود سے باز رہے ہے کہ خدا نے اس کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ آپ اس روک کو ہٹا دیجیے پھر کسی اور دلیل کی حاجت نہ رہے گی۔ سرحدی پٹھان کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی سود خوری میں مارواڑی سے دس قدم آگے ہوں گے۔ (مودودی)

بھی سکھایا۔ قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے سونے والے یورپ کے غازی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو تہلکہ کی تفسیر فرمائی ہے عوام نہیں تو کیا اس سے خواص بھی جاہل ہیں؟

سفے کا نہ لینا وطنی جرم بھی ہے

بلکہ سوچنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اس سفے کا نہ لینا صرف اپنی قوم کے ساتھ ہی نہیں بلکہ وطن والوں کے ساتھ بھی دشمنی ہے۔ زہر کھانے والے کو دیکھ کر صرف دل میں افسوس کرنا یہ حقیقی ہمدردی ہے؟ یا آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے زہر کا چھین لینا سچی بھی خواہی ہے[1]

مَنْ رَاٰیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔

"تم میں سے کوئی بُری بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ نہ زور رکھتا ہو تو زبان سے اسے پلٹے۔ اس کی بھی مجال نہ ہو تو دل سے بُرا جانے اور یہ بڑے کمزور ایمان والا ہے۔

حدیث کی ساری کتابوں میں سکھتے ہو۔ لیکن پھر بھی ایمانی ضعف کے دائرے سے نکلنے کی لوگوں میں جرأت نہیں ہوتی بخصوصاً جب استطاعت بھی ہو، حکومت کی قوت تمہارے ساتھ ہو، وطن والے اس معاملہ میں تمہارے ہمنوا ہوں تو بتاؤ تمہارے لیے کیا عذر باقی رہا؟ کیا جو لوگوں کے گال پر تھپیڑ مارتا ہے وہ جرم کے نتائج و آثار کو اس وقت تک سمجھ سکتا ہے جب تک کہ خود اس کے رخساروں کو بھی اسی گزندگی خوراک نہ دی جائے جس کو اب تک اس نے نہیں چکھا ہے[2]۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا

---

[1] زہر چھین لینا تو ضرور بہی خواہی ہے مگر اس سے چھین کر خود کھا جانا اور پھر اس زہر کو کشتہ طلا سمجھنا نہ بہی خواہی ہے نہ عقل مندی۔ (مودودی)

[2] ہندو، یہودی، عیسائی، سب آپس ایک دوسرے کے گال پر (باقی حاشیہ ص ۲۵۸ پر)

تو وہ بیچارے غریب انسانوں کی نازک کھالوں کو اپنی انگلیوں میں قوت پیدا کرنے کی مشق گاہ خیال کرلے گا۔ "فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ"۔

ہوسکتا ہے کہ جو گزند آج مسلمانوں کو پہنچایا جا رہا ہے جب اس کا احساس دوسروں کو بھی ہوگا تو ممکن ہے کہ حکومت ہی ان معاملات کو قانوناً بند کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اس وقت سب سے پہلے اس قانون کی تعمیل کے لیے جن کا سر مذہب جُھکا دے گا وہ اُس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت ہوگی جو دنیا میں اعلا اور برتر مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہی کے لیے مبعوث ہُوا تھا۔ نحن احق بمکارم الاخلاق۔ ہم مسلمان سب سے پہلے عمدہ بلند احکام کے حق دار ہیں" اس وقت ہم مذہب کے مجرم ہوں گے۔ اگر قانونِ وقت کے ساتھ غدر کریں گے۔ اگر حکومت نے بھی نہ سُنا تو تو کیا تم تعجب کرتے ہو کہ جو دکھ مسلمانوں کو پہنچا جب اسی میں دوسرے پڑیں گے تو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۷ سے) یہ تھپیڑ مار رہے ہیں، اور صدیوں سے مار رہے ہیں۔ مگر یہ گز نمکی خوراک چکھنے اور چکھانے کے باوجود وہ اس کے نتائج و آثار کو نہیں سمجھتے۔ پھر کیونکر امید کی جائے کہ مسلمانوں کے چند ہلکے سے تھپیڑ ان کو اس قدر چونکا دیں گے کہ وہ اس جرم ہی سے باز آجائیں گے! مولینا غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ سُود دینے والے صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم صرف سُود لیتے ہی ہیں دیتے نہیں ہیں۔ اس لیے ان کا یہ خیال ہے کہ جب مسلمان بھی سود لینے پر اُتر آئیں گے تو سود خوار غیر مسلم گھبرا اُٹھیں گے اور بالآخر حکومت ہند سُودی لین دین کو قانوناً ممنوع قرار دے دے گی۔ مگر صورت واقعہ یہ نہیں ہے۔ تمام غیر مسلم قومیں سُود لیتی بھی ہیں اور دیتی بھی ہیں۔ مسلمان ان سے سُود لے کر انہیں کوئی نیا مزہ نہیں چکھائیں گے۔ البتہ خود ایک نیا مزہ ضرور چکھیں گے جو ممکن ہے انہیں سبے خود کر کے "بھاؤ" اور "غیر بھاؤ" کے فرق سے غافل کر دے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ مسلمان کچھ بڑے سرمایہ دار بھی نہیں ہیں کہ اگر وہ سُود لینے پر اُتر آئے تو مارواڑیوں اور مہاجنوں کے دیوالے نکلنے کی نوبت آجائے گی، اور یہ سب کے سب ہار مان کر حُرمت سُود کا قانون بنوانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ (مودودی)

"ذہن توپ" کے اس وعظ سے وطن والے اسی طرح لاپروائی برتیں گے جس طرح وہ زبان وقلم کے واعظوں پر قہقہے لگاتے رہے ہیں۔ اگر انہوں نے آگے چل کر ہم سے اُن معاملات کے اٹھا دینے کا کبھی معاہدہ کیا تو کیا مسلمانوں کو ان کے خدا نے اس کی اجازت نہیں فرمائی ہے کہ

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ (الممتحنہ ۸:)

اللہ تم کو ان لوگوں سے نہیں روکتا جو دین میں تم سے نہیں جھگڑتے اور تم کو وطن سے بے وطن نہیں کرتے کہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو انصاف کرنے والوں کو خدا پیار کرتا ہے۔

ایسے معاہدوں پر جو اُمت سب سے پہلے دستخط کرے گی وہ وہی ہو گی جو تمام دنیا کے لوگوں کو نفع پہنچانے کے لیے ظاہر کی گئی ہے ہم دل سے بھی ان معاملات کو بُرا جانیں گے، زبان سے اس پر اصرار کریں گے، حکومت کو بھی ادھر بار بار توجہ دلائیں گے، وطن والوں سے بھی کہیں گے، جس طرح اب تک کہا ہے آئندہ بھی کہیں گے، زور سے کہیں گے، اور مسلسل کہیں گے، ہم کو وطن سے بے وطن اور اپنے گھروں

لہ ان کے قہقہے تو پھر بھی بند نہ ہوں گے بلکہ وہ ایک اور زور کا قہقہہ لگائیں گے، وہ کہیں گے آخر کار معاشی اور مالی معاملات میں اسلام کا ناقابلِ عمل ہونا ثابت ہو گیا اور یہ بات کھل گئی کہ سود کی حرمت عملی دنیا میں چلنے والی چیز نہیں جس طرح طلاق اور وراثت اور نکاح اول وغیرہ مسائل میں آپ ان کے مذہبی قانون کی جدید ترمیمات پر گرفت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اسلام کی کمزوری" کا اشتہار دینے کے لیے سود کے مسئلہ میں آپ کی بدلی ہوئی روش کو ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کریں گے۔ (مودودی)

سے بے گھر بنانے پر وہ جس قدر بھی چاہیں اصرار کریں، لیکن ہم ان کی بہی خواہی میں کبھی کمی نہ کریں گے اور اسی بہی خواہی کے سلسلہ میں زبان سے آگے بڑھ کر ہم ہاتھ سے بھی اپنے :-

"نَہْیٌ عَنِ الْمُنْكَرِ" "بری باتوں سے روکنا"

اور

"اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ" "اچھی جانی پہچانی باتوں کا حکم دینا"[1]

کے آسمانی فریضہ کو ادا کریں گے جس کے لیے ہم بنائے گئے ہیں تا آنکہ وطن کے فرزندوں کا، ہمارے پڑوسیوں کا اُس کی خرابی و ضرر رسانی پر اتفاق ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے دل یوں ہی ملیں گے، اور وہ تو انشاء اللہ ایک دن مل کر ہی رہیں گے۔

اسلامی حکومتوں اور ریاستوں کا حکم

مسئلہ ختم کرنے سے پہلے چند باتیں اور بھی قابلِ ذکر رہ جاتی ہیں، آخر ان کو کیوں چھوڑا جائے۔ جب اسلامی قوانین ہماری رہنمائی و دست گیری کے لیے ہر حال میں تیار ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن اسلامی ممالک میں شرعی قانون کسی نہ کسی وجہ سے اُٹھ گیا ہے ان کا کیا حکم ہے؟ ہاں وہاں کے حکام و ولاۃ سلاطین و ملوک تو

---

[1] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ طریقہ تو نہایت ہی عجیب ہے کہ جس منکر سے ہم دوسروں کو روکنا چاہتے ہیں اسی میں خود مبتلا ہو جائیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص شراب پی کر دنگا فساد کرتا ہو اور نصیحت سے نہ مانے تو ہم خود اس کی ضد میں شراب پییں اور ویسا ہی دنگا فساد مچا کر اس سے کہیں کہ دیکھو اس حرکت سے یہ تکلیف ہوتی ہے، اب یا تو ہم سے معاہدہ کرو کہ نہ تم شراب پیو گے نہ ہم پئیں گے، یا نہیں تو یاد رکھو کہ ہم تم سے زیادہ شراب پی کر اور تم سے زیادہ دنگا کر کے دکھائیں گے۔ اس طریق نصیحت سے ترک مے خواری کا معاہدہ تو شاید نہ ہو، البتہ ہو گا یہ کہ زاہد کو در میخانہ پر دیکھ کر رندے خوار ایک نعرۂ فتح بلند کرے گا اور پکار اُٹھے گا کہ مے کشوں کی ٹولی میں شیخ کی آمد مبارک۔ (مودودی)

مسلمان ہیں۔ شامی میں اس کا فتویٰ موجود ہے کہ اگر سلاطین اسلام ان ممالک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی نہیں کرتے، تو ایسا ملک دار السلام ہی رہے گا۔ کہتے ہیں:۔

وبهذا اظهران ما فی الشام من جبل تیم الله المسمّٰی بجبل الدروز وبعض البلاد التابعة له کلها دار السلام لانها وان کانت بها حکم الدروز او نصاری ولهم قضاة علی دینهم وبعضهم یعلنون بشتم الاسلام والمسلمین لکنهم تحت حکم ولاة امورنا وبلاد الاسلام محیط ببلادهم من کل جانب واذا أراد ولی الامر تنفیذ احکامنا فیهم نفذها۔ (ص ۲۷۷ – شامی ج ۳)

اور اس سے معلوم ہوا کہ شام کا علاقہ کوہ تیم اللہ جس کا عام نام جبلِ دروز ہے اور دوسرے شہر جو اس کے تابع ہیں سب دار الاسلام ہیں کیوں کہ اگرچہ وہاں دروزیوں کا یا عیسائیوں کا قانون ہے اور ان کے جج و حکام ان ہی کے مذہب کے ہیں اور ان میں بعض علانیہ مسلمانوں کو اور اسلام کو گالیاں دیتے ہیں، لیکن چونکہ اسلامی حکومت کے ماتحت ہیں اور اسلامی ممالک ان کو چاروں طرف سے محیط ہیں اور مسلمانوں کا امیر اگر چاہے تو ان میں ہمارے (یعنی اسلامی) احکام نافذ کر سکتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جن ممالک میں مسلمان سلاطین یا ولاۃ امور باوجود ارادے کے اسلامی احکام کے نفاذ پر قادر نہ ہوں وہ دار الاسلام باقی نہیں رہ سکتے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

لہ مولانا کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مسلمان ریاستیں بھی دار الحرب کی تعریف میں داخل ہیں اور ان کی غیر مسلم رعایا بھی "حربی" ہے جس کے اموال مباح ہیں (باقی ص ۲۶۲ پر)

باقی یہ مسئلہ کہ اس قسم کے غیر اسلامی ممالک میں جمعہ، عید وغیرہ کا نظم کس طرح ہوگا، شامی میں اس کے متعلق موجود ہے:۔

کل مصر فیہ والی مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الايامى ناقلاً عن جامع الفصولين۔ (ص ۲۷۷۔ ج ۳)

ہر وہ شہر جہاں کا رئیس کفار کی منظوری سے ہو اس کی جانب سے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۸ سے) اس اجتہاد کے لیے کم از کم فقہ حنفی میں تو کوئی گنجائش ہے نہیں۔ فقہا کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔ حواشی درالمختار للطحاوی میں ہے۔ لو اجریت احکام المسلمین واحکام الشرك لا تكون دار الحرب فتاری بزازیہ میں ہے۔ فاذا وجدت الشرائط كلها صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل و الشرائط يبقى ما او يترجح جانب الاسلام احتياطاً۔ خزانۃ المفتین میں ہے ان دار الاسلام لا تصير دار الحرب متى لم يبطل جميع ما صارت به دار الاسلام فما بقى علقة من علائق الاسلام يترجح جانب الاسلام۔ ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ حیدر آباد اور بھوپال اور جوناگڑھ وغیرہ ریاستیں دار الحرب ہوگئی ہیں اور ان کی غیر مسلم رعایا حربی ہے۔ مولانا جانتے ہوں گے کہ فقہ اسلامی میں دار الحرب دار الاباحۃ کا دوسرا نام ہے جہاں عارضی طور پر قانون اسلامی کی اکثر بندشیں ضرورۃً کھول دی جاتی ہیں۔ اگر ان عارضی اباحتوں کو استمراری حیثیت دے دی جائے تو مسلمانوں کا مسلمان رہنا غیر ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر لارڈ ولزلی کے سبسیڈیری الائنس میں شریک ہونے کے بعد سے علماء اسلام حیدر آباد کو دار الحرب قرار دے کر دار الاباحت بنا دیتے تو ۱۳۶ برس کے اندر اس ریاست کے مسلمان اس قدر مسخ ہو چکے ہوتے کہ آج ممالک اسلامیہ کا کوئی شخص ان کو پہچان بھی نہ سکتا کہ یہ مسلمان ہیں۔ (مودودی)

جمعہ اور عید کا قیام کرنا جائز ہے اور اس ملک کا خراج لینا بھی نیز عدالت کے قضاۃ (حکام) کے تقرر کا بھی اسے اختیار ہے، اور بیواؤں کی شادی بھی وہی کردے۔

لیکن جس غیر اسلامی ملک میں غیر اسلامی حکومت کا کوئی تسلیم شدہ مسلمان رئیس نہ ہو تو اس کے متعلق یہ حکم ہے:-

واما فی بلاد علیها ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب والی مسلم (صفحہ ایضاً)

لیکن ایک ایسا ملک جہاں کے ولاۃ کفار ہیں تو مسلمان کو یہ جائز ہے کہ اس شہر میں بھی خود جمعہ اور عیدین قائم کریں، قاضی مسلمان باہمی سمجھوتہ سے مقرر کرلیں، لیکن ان پر مسلمان رئیس کی تلاش واجب ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن مسائل میں مسلمانوں کو "قضاء شرعی" کی ضرورت پیش آتی ہے، "دین کامل" نے غیر اسلامی ممالک میں اس کا کیا چارۂ کار بتایا ہے، اور غالباً اس تفصیل کے بعد عہدِ حاضر کے اسلامی ممالک کے احکام واضح ہوگئے۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ الْخَاتِمِ الرُّسُلِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(مولانا کے سابق مضمون کی اشاعت پر بعض اہلِ علم نے اعتراضات کیے تھے جن کے جواب میں مولانا نے یہ مضمون تحریر فرمایا تھا۔)

مرتب

(۱) مسئلہ کی تعبیر میں ضرور مسامحت ہوئی ہے جس سے شدید غلط فہمی کا اندیشہ

ارقام فرمایا گیا ہے کہ "غیر اسلامی حکومتوں کے ماتحت ربوٰ، ربوٰ نہیں رہتا۔ الخ۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی میں ہر شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اس کے ساتھ اس قسم کے معاملات جائز ہیں، اور ان کے اموال غیر معصوم و مباح ہو جاتے ہیں حالانکہ مقصد یہ نہیں ہے بلکہ یہ حکم صرف ایسی غیر اسلامی اقوام مثلاً یہود و نصاریٰ سے مجوس و ہنود وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے جن کی ذمہ داری کسی اسلامی حکومت نے نہیں لی ہے" ——— میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں امام محمد کی "سیر کبیر" کا مشہور فتویٰ نقل کیا ہے اُسی سے غایت اطمینان کے لیے اس قانون کی یہ دفعہ بھی نقل کر دیتا ہوں۔

وَلَوْ كَانَتْ هٰذِهِ الْمُعَامَلَةُ بَيْنَ الْمُسْلِمَيْنِ مُسْتَأْمِنَيْنِ او اسيرين في دار الحرب كان باطلاً مردوداً لانهما يلتزمان أَحْكَامَ الْإِسْلَامِ فِي كُلِّ مَكَانٍ۔ (سیر کبیر ج ۴ - ص ۲۲۶)

اور اگر یہ معاملہ دو مسلمانوں کے درمیان ہو جو دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں معاہدہ امن کر کے مقیم ہوں، یا قیدی ہوں، تو یہ معاملہ باطل و مردود ہوگا کیونکہ یہ دونوں اسلامی قوانین کے ہر جگہ ذمہ دار ہیں[1]

---

[1] اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے دو شہری علاقہ غیر میں ایک دوسرے سے سود نہیں لے سکتے۔ لیکن دار الاسلام کی رعایا کا کوئی مسلمان فرد اگر دار الحرب میں امان لے کر جائے تو وہ دار الحرب کے مسلمان باشندے سے سود لے سکتا ہے کیونکہ فقہ حنفی میں کافر حربی کی طرح اس مسلمان کا مال بھی معصوم نہیں ہے بحر الرائق میں ہے وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کالحربی عند ابی حنیفۃ لان مالہ غیر معصوم عندہ فیجوز للمسلم الربا معہ (جلد ۶ ص ۱۴۷) اس لحاظ سے مولانا کی تعبیر کے مطابق اگر ہندوستان دار الحرب ہے تو سرحدی پٹھانوں کے لیے ہندوستان نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ مسلمانوں سے بھی سود لینا حلال و طیب ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہاں کے مسلمانوں سے جوا بھی کھیل سکتے ہیں اور حرام چیزیں بھی ان کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں، کما فی الفتح ج ۵ ص ۳۰۰۔

(مودودی)

قیدی اسیر کے لیے فقہی طور پر ضروری نہیں کہ وہ جیل خانہ میں ہو بلکہ ہر وہ شخص جو کسی ملک سے دوسرے ملک میں بغیر اجازت یا پاسپورٹ کے نہیں جا سکتا وہ اسیر ہے[1] والتفصیل ان شاء اللہ فی وقت اٰخر۔

(۲) دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ بلاشبہ میں نے ذرا عجلت سے کام لے کر اس مضمون کو قبل از مشورہ شائع کرا دیا۔ اس عبد خاطی و عاجز کو اپنے اس قصور کا اعتراف ہے۔ لیکن میں نے جن جذبات اور ہیجانات سے مجبور ہو کر اس مضمون کو لکھا تھا اس سے خدائے خبیر و بصیر خوب واقف ہے۔ ماسوا اس کے اس مسئلہ کی بنیاد جن مقدمات پر ہے وہ کل دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان دار الکفر ہے۔ دوسرے یہ کہ دار الکفر میں عقود فاسدہ فی الاسلام کے ذریعہ سے اموال غیر معصومہ کا لینا مباح ہے۔

ان میں سے پہلے مقدمہ کے متعلق میں نے ہندوستان کے اکثر علماء تقاوت و ارباب فہم و تقویٰ کو متفق پایا۔ البتہ دوسرے مقدمہ کے متعلق میں نے اُن کرام و اکابر علماء سے بالتفصیل نہیں دریافت کیا، جن کے اسمائے گرامی آپ نے درج کیے ہیں، اور جن میں سے اکثر اس خاکسار کے اساتذہ یا فی حکم الاساتذہ ہیں۔ صرف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی کی رائے گرامی کا مجھے علم تھا کہ وہ اس مسئلہ میں فقہ حنفی کے اس جزئیہ کے متعلق مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فتاویٰ نیز تفسیر

---

[1] اگر اسیر کی تعریف صرف اتنی ہی ہے تو ہندوستان کے تمام مسلمان مستامن نہیں بلکہ اسیر قرار پائیں گے، اور اسیر کے احکام مستامن کے احکام سے بالکل مختلف ہیں۔ اسیر جنگ کے لیے قانونِ ملک کی پابندی بھی لازم نہیں۔ وہ چوری اور قتل اور رشوت دہی کا بھی حق رکھتا ہے بحر الرائق میں ہے لان الاسیر یباح لہ التعرض وان اطلقوہ طوعاً لانہ غیر مستامن فھو کالمتلصص فیجوز لہ اخذ المال وقتل النفس دون استباحۃ الفروج (ج ۵ ص ۱۰۷) اگر قانون کے مقاصد سے قطع نظر کر کے صرف اس کے الفاظ سے غرض رکھی جائے تو آزادی کی اس سے بھی زیادہ گنجائشیں نکل سکتی ہیں۔ (مودودی)

میں دوسرے مقدمہ کی صحت میں حدیثاً و اصولاً کلام کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس ناچیز کی رسائی تھی امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کو ہیں نے اوفق الکتاب والسُّنۃ پایا۔ امام صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح "لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" "اپنی جانوں کو نہ مارو" کا منصوص اور بظاہر عام حکم صرف مسلمانوں تک محدود ہے ورنہ قانون جہاد بے معنی ہو جاتا ہے، اسی طرح "لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" تم اپنے مالوں کو اپنے درمیان ناجائز ذرائع سے نہ کھایا کرو" اور اسی کی ایک ذیلی تفصیل "لا تاکلوا الربٰو" "سود نہ کھاؤ" کا بظاہر عام حکم بھی صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ خصوصاً جب "اموال محرمہ" کے حکم نہی میں "بینکم" کی تصریح بھی ہے تو وہ قانون قتل کی عمومیت سے اور بھی زیادہ خاص ہو جاتا ہے۔

مولانا کے اس بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خون کا احترام اور کسب اموال میں حرام و حلال کی تمیز، اور سود کی حرمت سب کچھ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہے۔ دائرہ اسلام کے باہر نہ تو غیر مسلم انسانوں کے خون کی کوئی وقعت ہے اور نہ ان سے مالی معاملات میں حلال و حرام کی کوئی تمیز۔ اس سے بڑھ کر اسلامی قانون کی غلط نمائندگی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ اس آیت کی رُو سے ہر انسان کی جان اصلاً قابلِ احترام ہے۔ اس کے حلال ہونے کی صورت صرف یہ ہے کہ حق اس پر قائم ہو جائے۔ جہاد میں یہ حرام اسی طرح "حق" کی خاطر حلال ہو جاتا ہے جس طرح قصاص میں خود مسلمان کا حرام خون بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اگر اصولاً کافر غیر ذمی کو اسلام نے "حربی" قرار دیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام اور جماعت سے الگ ہو کر ہر مسلمان ہر غیر ذمی کافر پر جب چاہے "حق" قائم کر دے اور جہاں چاہے قتل کر دے اور لوٹ لے۔ اگر ایسا ہو تو ایک مسلمان اور ایک انارکسٹ میں کیا فرق باقی رہا؟ اسی طرح مال کمانے اور خرچ کرنے کے جو طریقے اسلام نے حرام کیے ہیں وہ سب قطعی طور پر حرام ہیں۔ ان میں یہ امتیاز نہیں ہے کہ مسلمان سے مال لینے کا جو طریقہ حرام ہو، کافر سے مال (باقی ص ۲۶۷ پر)

یہ سچ ہے کہ "ربٰو" کا قانون سخت ہے۔ لیکن کیا قتل سے بھی زیادہ سخت؟ قرآن نے ایک شخص کا قتل عام بنی آدم کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے جس کی جزا عٖ میں جہنم کے عذاب، خلود ابدی کی دھمکی دی گئی ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسلام نے اس سخت قانون کے ایک رُخ کو (اسی رُخ کو جو امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک "اموال" کے متعلق ہے) ثواب اور بڑا ثواب قرار دیا ہے۔ آخر امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کیا کرتے؟ قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۶ سے) لینے کا وہی طریقہ حلال ہو۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا اور اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ ان احکام میں سے کس حکم کو صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے؟ اگر مسلمانوں کا یہی مسلک ہو کہ شراب کو حرام بھی کہیں اور پھر غیر مسلموں کے ہاتھ بیچیں بھی، جوئے کو حرام بھی کہیں اور غیر قوموں سے کھیلیں بھی، سُور کو حرام بھی کہیں اور غیر قوموں سے کھیلیں بھی، سُور کو حرام بھی کہیں، اور سُود کھانے والوں کے ہاتھ فروخت بھی کریں، سُود کی حرمت میں تقریر بھی کریں اور پھر غیر مسلم قوموں سے سُودی لین دین کو حلال وطیّب بھی سمجھیں، تو دین اسلام ایک مضحکہ بن جائے گا۔ اور کوئی صاحب عقل ایسے مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا اس غلط تعبیر کو امام ابو حنیفہ رح کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے ان عام احکام میں جو استثناء تجویز کیا ہے وہ صرف خاص جنگی ضروریات میں ان لوگوں کے لیے ہے جو مبتلائے جنگ ہوں۔ اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کی پوری پوری آبادیاں مستقل طور پر غیر قوموں کے ساتھ تجارتی و مالی معاملات میں حرام و حلال کی تمیز اٹھا دیں، اور نسل در نسل اور پشت در پشت اسی حرام خوری پر زندگی بسر کرتی رہیں۔ (مودودی)

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا۔

اللہ تم سے مغانم کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم لوگے۔

کیا اس کا یہ مطلب یہ ہے کہ یہ اموال مسلمان خریدیں گے؟ یا وراثت میں پائیں گے؟ یا ان کو کوئی ہبہ کرے گا؟ پھر بزور ہی نہیں بغیر زور و قوت کے بھی جو مال ملے اُس کے متعلق تصریح ہے کہ یہ وہ چیز ہے کہ:۔

وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ۔ (الحشر:۱)

جو پلٹایا خدا نے اپنے رسولؐ کے پاس تو تم نے نہ اس پر اُونٹ دوڑائے نہ گھوڑے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلّط کر دیتا ہے۔

صرف جنگ کے موقعہ پر اس کا وعدہ نہیں کیا گیا، بلکہ سب کو معلوم ہے کہ:۔

إِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ۔

جب اللہ نے تم سے دو گروہوں میں سے ایک گروہ کے متعلق یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہارے لیے ہے۔

ان طائفوں میں کون نہیں جانتا کہ خدا نے اس طائفہ کا بھی وعدہ کیا تھا جو "عیر" یعنی قافلۂ تجارت تھا؟ اور کیا وعدہ کیا تھا؟ "إِنَّهَا لَكُمْ" وہ تمہارے لیے ہیں" مسلمانوں کے لیے وہ بذریعہ بیع و فروخت، تجارت، ہبہ، وراثت، ہدیہ، صدقہ، خیرات، آخر کس طور پر وعدہ کیے گئے تھے[1]؟ یہی ذریعہ اگر مسلمانوں کے لیے اموال

---

[1] یہ ایک برسرِ جنگ قوم کا تجارتی قافلہ تھا، گو بالفعل مقاتل نہ تھا غنیم کی تجارت میں مزاحمت کرنا، اس کے تجارتی جہازوں یا قافلوں کو پکڑ لینا اور اس کے اموال پر قبضہ کر لینا قانونِ جنگ میں بالکل جائز ہے۔ مولانا کوئی ایسی مثال پیش فرمائیں جس میں ماسوا حالت جنگ کے (باقی ص ۲۶۹ پر)

کے حصول کا قرار دیا جائے تو کیا وہ ذریعہ باطل اور لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل کے نیچے داخل ہو گا؟ بخاری میں ہے کہ حضرت ابو بصیر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صلح حُدَیبیہ کی رُو سے جب مدینہ میں رہنے کی اجازت نہ ملی تو وہ سمندر کے کنارے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جم گئے اور ان کا مشغلہ کیا تھا؟ امام بخاری راوی ہیں :-

فَوَاللهِ مَا يَسْمَعُوْنَ بِعِيْرٍ خَرَجَتْ لِقُرَيْشٍ اِلَى الشَّامِ
اِلَّا اعْتَرَضُوْا لَهَا فَقَتَلُوْهُمْ وَاَخَذُوْا اَمْوَالَهُمْ۔

بخدا قریش کے جس قافلے کے متعلق وہ سنتے کہ شام کی طرف نکلا ہے اس سے وہ تعرض کرتے اور اہل قافلہ کو قتل کر کے ان کے اموال چھین لیتے۔

کیا اس سے بھی زیادہ تشریح کی ضرورت ہے؟ قرآن میں تو صرف "عیر" کا وعدہ تھا، لیکن یہاں تو وقوع ہوا۔ کیا یہ قانون فقہ حنفی کا ہے یا نصوص بینہ کا مقتضیٰ ہے؟ عجیب بات ہے کہ جس قانون کے ذیل میں امام صاحب نے اس جزئیہ یا دفعہ کو پیدا فرمایا ہے (یعنی قانونِ غنیمت) وہ تو صرف امتِ محمدیہ کے لیے بروئے روایات صحیحہ مخصوص مانا جاتا ہے، لیکن پھر بھی لوگ کہے جاتے ہیں کہ اگر "ربٰو" کا کاروبار غیر اقوام کے ساتھ جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے متعلق قرآن مجید میں کیوں فرمایا:-

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔

اور یہودیوں کے سُود لینے کی وجہ سے جس سے وہ روکے گئے اور لوگوں کے اموال کو باطل و ناجائز ذرائع سے کھانے پر۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۸ سے) غیر ذمی کافروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مطلقاً مباح الدم والاموال قرار دیا گیا ہو، اور فرداً فرداً ہر مسلمان کو یہ حق بخشا گیا ہو کہ جس غیر ذمی کو وہ جب اور جہاں پائے لوٹ لے۔
(مودودی)

جب یہودیوں پر غنیمت ہی حرام تھی تو پھر کس بنا پر ان کے لیے سود جائز ہوتا۔ اور یہ بھی اسی وقت کہا جائے گا جب یہ ثابت ہو لے کہ وہ صرف غیر یہودیوں سے اس کا کاروبار کرتے تھے۔ مولانا شبلی نے اپنی سیرت میں ابوداؤد کی روایت کو متعدد بار نقل فرمایا ہے۔ اس سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس تشدد کی بنیاد مسئلہ غلول (یعنی قبل تقسیم کے اموالِ غنیمت میں تصرف کرنے) پر ہے جیسا کہ خود حضرت سمرہ بن جندب نے "کابل" کی جنگ میں اس کی توضیح فرما دی۔ ابولبید راوی ہیں کہ ہم لوگ کابل میں سمرہ بن جندب کے ساتھ تھے۔ لوگوں کو مالِ غنیمت میں ہاتھ آیا تو لگے لوٹنے۔ حضرت سمرہ رض اس پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے "نہبی" سے منع فرمایا۔ لوگوں نے سب مال واپس کر دیا۔ پھر حسبِ تقسیم شرعی انہوں نے بانٹ دیا (جمع الفوائد) اس میں یہ نہیں ہے کہ اصل مالکوں کو واپس دے دیا بلکہ قبل تقسیم کے لوٹ مار کرنے سے ممانعت کی گئی تھی جو غلول تھا۔

"ربٰو" کا قانون کب سے نازل ہوا یہ مسئلہ فیہ ہے "لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفة" تو بہت پہلے نازل ہوا۔ لیکن اس کو شراب کی طرح تدریجی غیر قطعی حکم قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن "ربٰو" کی جزئی فروع کی حرمت پر عمل درآمد مسلمانوں میں ۷ھ سے شروع ہو گیا تھا۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں چاندی کے ایک برتن کی فروخت کے معاملہ میں فرمایا۔

اَرْبَيْتُمَا فَرُدُّوا

تم دونوں نے ربٰو کا معاملہ کیا، پس انہوں نے واپس کر دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ "دار الاسلام" میں یہ قانون ۷ھ سے نافذ ہو چکا تھا۔ لیکن سارے عرب میں کب نافذ ہوا؟ سب کو معلوم ہے کہ عام فتح میں بھی نہیں بلکہ حجۃ الوداع میں ربا الجاہلیۃ کے سقوط کا اعلان حکومت نبویہ کی جانب سے کیا گیا۔۔۔۔۔۔ اس سے کیا یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ملک میں اسلامی اقتدار قائم

نہ ہو وہاں ان معاملات کی نوعیت وہ نہیں رہ سکتی جو اسلامی اقتدار کے بعد ہو جاتی ہے[1]، ورنہ کم از کم حضرت عباس رضؓ جو حجۃ الوداع سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اُن کے ربوٰ کو قطعاً ۸ھ سے پہلے ساقط ہو جانا چاہیئے تھا نہ کہ حجۃ الوداع[2] میں۔ تعجب یہ ہے کہ بعض اکابر کو اسی حجۃ الوداع کی روایت سے شبہ ہُوا کہ اگر غیر مسلموں سے ربوٰ جائز ہوتا تو قبل اسلام کا جو سودی بقایا تھا اس کو شارع علیہ السّلام نے کیوں

---

[1] اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کسی ملک میں سُودی کاروبار کی ممانعت کا عام حکم صرف اسی وقت جاری کریں گے، جب کہ وہ اس ملک پر قابض و متصرف ہوں اور اپنے احکام کو غیر مسلموں پر بھی نافذ کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔ ہر ذی فہم سمجھ سکتا ہے کہ ملک پر قبضہ ہونے سے پہلے ملک میں قانون کے نفاذ کا حکم دینا صریح غیر معقول بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ربا الجاہلیت کے سقوط کا اعلان فرما دیتے جب کہ درحقیقت ربا الجاہلیت لینے اور دینے والے آپؐ کے تحت حکم آئے ہی نہ ہوں۔ البتہ جو لوگ آپؐ کے تحت حکم تھے (یعنی مسلمان) ان کو آپؐ نے سودی لین دین سے منع فرما دیا تھا قبل اس کے کہ ملک عرب میں سودی کاروبار مسدود ہو۔ (مودودی)

[2] حضرت عباسؓ کے متعلق ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد مکّہ واپس چلے گئے تھے اور وہاں مسلمان ہونے کے بعد وہ سود کا جو کاروبار کر رہے تھے اس کی کوئی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تھی (ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للامام السرخسی ج ۱۴ ص ۵۷) یہ نہیں کہا گیا سکتا کہ حضورؐ کو کب اس کی اطلاع ہوئی۔ بہرحال جب حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے احکام الٰہی کے تحت ربا کی عام ممانعت کا اعلان فرمایا تو سب کے ساتھ حضرت عباسؓ کے سُودی بقایا بھی ساقط کیے گئے۔ یہ واقعہ اس باب میں قطعی الثبوت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس سودی کاروبار کو جائز رکھا تھا۔ (مودودی)

ساقط کیا؟

بلاشبہ اگر مسئلہ یہ ہوتا کہ نفس عقد ربٰو سے سود کا مستحق سُود خوار ہو جاتا ہے تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ حقوق ثابتہ کے اسقاط کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ کی بنیاد استحقاق بواسطہ الربٰو پر نہیں ہے اباحت کا حکم باقی رہے گا۔ جب ملک اسلامی ہو جائیگا تو غیر معصوم معصوم ہو جائے گا۔ پھر اس معصوم کو غیر معصوم کس طرح قرار دیا جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب نجران کے لوگوں نے اسلامی حکومت کی ذمہ داری قبول کر لی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اب اس کاروبار کو ترک کر دیں، کیوں کہ عہد ذمہ کی وجہ سے ان کے اموال معصوم ہو چکے تھے۔

لہ حکم قرآنی کی یہ توجیہہ درست نہیں۔ اباحت کے مسئلہ کا اس مسئلہ سے کیا واسطہ؟ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے: "فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ" جو شخص خدا کی نصیحت مان کر سُود خواری سے باز آجائے وہ پہلے جو کچھ سُود کھا چکا ہے وہ اس کے لیے معاف ہے، اب وہ اس سے واپس نہیں دلایا جائے گا۔ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا، اور اب جو سُود تمہارے لوگوں پر چڑھے ہوئے ہیں ان کو تم چھوڑ دو۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ اگر اس حکم کی پابندی تم نے نہ کی تو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ بات سراسر حکمت عملی پر مبنی تھی اور ہر حکومت کسی معاملہ احکام امتناعی نافذ کرتے وقت ایسا ہی کیا کرتی ہے۔ قانون کے اعلان سے قبل جو سُود لیا اور دیا جا چکا تھا اگر اس کی واپسی کا حکم دیا جاتا تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا جو کبھی ختم ہی نہ ہو سکتا۔ اور اگر اعلان کے بعد پچھلے سُودی بقایا وصول کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو قانون بے اثر ہو کر رہ جاتا، اور نہ معلوم کب تک ان کا بقایا کی تحصیل کا سلسلہ جاری رہتا۔ لہذا بیک وقت سُود اور اس کے معاملات کا سلسلہ منقطع کر دینا ہی حکمت تشریع کے نقطۂ نظر سے ایک کارگر تدبیر ہو سکتا تھا۔

(مودودی)

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا صحابہ کے طرزِ عمل میں بھی ایسا کوئی خصوصی اثر ہے جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے غیر مسلموں سے ربوٰ کا خاص کر کے معاملہ کیا ہو؟ امام محمد نے اس کے جواب میں "سیر کبیر" میں حضرت عباس رضؓ کا عمل پیش کیا ہے کہ وہ فتح مکہ سے بیشتر اسی کاروبار کے لیے مدینہ سے مکہ جاتے تھے جو اس وقت تک دار الاسلام نہ تھا[1]۔ اسی طرح ربوٰ تو نہیں، لیکن یہ تو حدیثوں سے ثابت ہے کہ قمار کا معاملہ ابو بکر صدیق رضؓ نے کیا اور بدر کے بعد اس کی آمدنی انہوں نے لی۔ یہ کہنا کہ یہ فعل[2] حکمِ "میسر و قمار" کے نزول سے پہلے کا ہے، بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ایران نے روم سے شکست انہی ایام میں کھائی جب کفارِ قریش کو مسلمانوں سے ہزیمت ہوئی۔ حضرت صدیق رضؓ کا اس معاملہ میں فریقِ ثانی اُمیہ ابن خلف تھا جو بدر میں مارا گیا۔ شرط سو اونٹوں کی تھی۔ حضرت صدیق رضؓ نے اس کے

---

[1] بالفرض اگر حضرت عباس رضؓ کا یہ سودی کاروبار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت سے بھی ہو تب بھی یہ حقیقت ہے کہ عام الفتح سے پہلے تک مکہ اور اس کے اطراف کے تمام قبائل مسلمانوں سے برسرِ جنگ تھے۔ عام الفتح کے بعد اگرچہ مکہ اسلامی حکومت کے ماتحت آگیا مگر نواحی علاقوں میں جو مشرکین آباد تھے ان سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا پس یہ مثال زیادہ سے زیادہ اس امر کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کہ حالتِ جنگ میں دشمن سے عقودِ فاسدہ پر معاملہ ہو سکتا ہے (مودودی)

[2] یہ "فعل" سے کیا مراد ہے؟ اس فعل کے دو جزء ہیں ایک شرط کرنا۔ دوسرے شرط کا مال وصول کرنا۔ پہلا جزء تو یقیناً میسر و قمار کی حرمت نازل ہونے سے پہلے کا ہے کیونکہ وہ ہجرت سے چھ سات سال قبل کا واقعہ ہے اور میسر و قمار کی حرمت کے احکام ہجرت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ رہا دوسرا جزء یعنی شرط کے اونٹ وصول کرنا تو یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے۔ غالباً تحریم قمار کا حکم نازل ہونے کے بعد ہی کا ہے۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضؓ کو یہ مال اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہ دی بلکہ صدقہ کرنے کا حکم دیا؟ (مودودی)

ورثہ پر دعویٰ کیا اور وہ دعویٰ مسموع ہوا۔ سو اونٹ ان کو ملے۔ مدینہ آئے۔ یہ صحیح ہے کہ ٹھیک طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ اونٹ بدر سے کتنے سال بعد وصول کیے گئے لیکن بعید از قیاس ہے کہ غم و غصّہ کے بھرے ہوئے قریش نے ٹھیک بدر کے بعد انصاف کو اتنی راہ دی ہو گی کہ سو اونٹ اصل شرط لگانے والے سے نہیں بلکہ اس کے ورثہ سے حضرت صدیق رض کو دلوائے ہوں گے۔ بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اگر طے ہوئی ہو گی تو صلح حدیبیہ کے بعد طے ہوئی ہو گی اور یہ مسلّم ہے کہ خمر (شراب) اور میسر (قمار) کی تحریم کا حکم اُحد کے قریب قریب نازل ہوا تھا۔ بخاری کی روایتوں سے یہ ثابت ہے۔ پس غالب قرینہ یہی ہے کہ واقعہ حرمت قمار کے نزول کے بعد کا ہے۔ تاریخی طور پر اگر ان واقعات کی جستجو کسی مدِّنظر ہو تو سیرۃ النبی، مولانا شبلی مرحوم سے میرے بیان کی توثیق کر سکتے ہیں، خصوصًا جن لوگوں کی عربی تک رسائی نہیں ہے۔ بہر حال سیر و آثار نہ بھی ہوں تو کیا اثر سے زیادہ وزن دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہیں بلکہ قانونی قول نہ ہو گا جس کے راوی تو دامام ابوحنیفہ رح ہیں؟ امام شافعی رح نے قاضی ابو یوسف رح کے حوالہ سے بروایت ابوحنیفہ رح اس روایت کو نقل کیا ہے:۔

عَنْ مَکْحُوْلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ۔ (کتاب الامام للشافعی)

مکحول سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان ربوا نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ یہ روایت مرسل ہے لیکن کیا اثر صحابہ کے ڈھونڈھنے والوں کے لیے ایک مرسل حدیث میں تسلی نہیں ہے؟ عجیب بات ہے کہ ابن سعد یا اصابہ سے اگر کوئی اثر نقل کر دیا جائے تو لوگ اس کی وقعت کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رح اپنے اعتماد پر ایک مرفوع مرسل قولی حدیث پیش کرتے ہیں تو اس کو صرف مرسل کہہ کر ٹالنا چاہتے ہیں۔ اس روایت کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خبر واحد ہے اس سے نص کی

تخصیص جائز نہیں لیکن کیا نص کی تائید بھی اس سے نہیں ہو سکتی؟ کیا اس کی وقعت آثار صحابہ کے برابر بھی نہیں؟ غالباً اس تفصیل کے بعد یہ مسئلہ صرف فقہ حنفی کا نہیں رہ جاتا۔ بہر حال میں اور بھی تفصیل کرتا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ ذرا ان لوگوں کا انتظار ہے جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کو اس مسئلہ میں مضمحل بنانا چاہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے فتاویٰ میں ایک سے زائد مقامات پر اس کے متعلق صریح فتویٰ صادر فرما چکے تھے۔ اگر ان کے فتویٰ میں کلام ہے تو کیا ہندوستان میں کسی کے پاس حدیث کی سند محفوظ رہ سکتی ہے؟ جمعیۃ العلماء کے اخبار "الجمعیۃ" میں بھی اس کا فتویٰ شائع ہو چکا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن بنک کے سُود لے لینے کا فتویٰ دیا تھا۔ حرام مال لے کر صدقہ کرنے کی اجازت کون دے سکتا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے سامنے مسئلہ کی وسعت موجود تھی۔ ورنہ کم از کم میں ان کے اس فتویٰ کی توجیہہ سے عاجز ہوں۔ مولانا عبدالحیؒ صاحب مرحوم نے اپنے فتاویٰ میں گو ہندوستان کی تصریح نہیں کی لیکن مطلقاً دارالکفر میں انہوں نے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور متعدد بار دیا ہے۔ بریلی اور بدایوں کے علماء کو بھی اس سے کم از کم میرے علم میں اختلاف نہیں۔ بااین ہمہ میں نے اپنے مضمون میں افتاء کا رنگ نہیں اختیار کیا ہے بلکہ مسئلہ کی تشریح کرنے کے بعد استفتاء کیا ہے علماء سے پوچھا ہے کہ کیا ہندوستان میں اس مسئلہ کے نفاذ کا وقت آگیا ہے؟

مگر سچ پوچھتے ہیں تو ذاتی طور پر اسی شبہہ کی وجہ سے جسے آپ نے نقل فرمایا ہے میں اس کے لکھنے میں متردد تھا۔ پھر کیا کہوں کن مظالم بے جا نے آخر میرے ہاتھ سے صبر کے دامن کو چھڑا لیا مسلمان جلائے گئے، لوٹے گئے، برباد کیے گئے اور کیے جا رہے ہیں[1] میں ان حالات کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ کوئی اور صورت نظر کے سامنے نہ تھی۔

---

[1] آگے چل کر مولانا نے خود ہی اپنے اس ارشاد کا جواب دے دیا ہے۔ (مودودی)

مالی مدافعت، یا مالی حملہ کی صورت سامنے تھی، پیش کردی گئی اور اسی وجہ سے اس کا نام میں نے فے رکھا، کیونکہ شامی میں جزئیہ موجود تھا۔

وَمَا يُوْخَذُ مِنْهُمْ بِلَا حَرْبٍ وَلَا قَهْرٍ كَالْهَدَايَةِ وَالصُّلْحِ فَهُوَ لَا غَنِيْمَةَ وَلَا فِيْ وَحُكْمُهُ حُكْمُ الْفَيْءِ - (ص ۲۵۰ ج ۳)

اور ان سے جو کچھ بغیر جنگ اور قہر کے لیا جائے مثلاً مال صلح تو وہ غنیمت ہے اور نہ فے البتہ اس کا حکم فے کا حکم ہے۔

پس جو حکم فے میں ہو اگر مجازاً اُسے "فے" کہا جائے تو کیا حرج ہے؟ اور اگر اجازت ہو تو کیا اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ "زنا" کے خطرے سے کیا ترک نکاح کا فتوٰے دیا جاسکتا ہے؟ واقعی مسلمان جو بعد میں باہم لڑ پڑے کیا وہ قانون قتال کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ خطرات بھی واقعی ہیں؟

لیکن اس کے ساتھ مجھے ان مولویوں سے ضرور خطرہ ہے جو زوال حکومت کے بعد معمولی معمولی باتوں پر تکفیر کا فتویٰ صادر کرکے فسخ نکاح و ناجوازیِ اولاد کا حکم لگا رہے ہیں۔ اس صورت میں بالکل ممکن ہے کہ ہر مسلمان دوسرے کے کفر کا فتویٰ لے کر آپس ہی میں اُس فعل کو شروع کردے گا جو اس کے لیے قطعاً مورث عذاب جہنم ہے۔ لیکن کاش اس فتویٰ کو عملی شکل دینے کے لیے یہ علما ان مکروہ طریقوں سے باز آئیں، ورنہ ہر شخص اپنی نیتوں کا خود ذمہ دار ہے۔

لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دِيْنَارٍ يُصِيْبُهَا وَامْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهَا۔

ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔ چنانچہ جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہو، اور جس کی ہجرت دنیا کے فائدے کی خاطر ہو، اور جس کی ہجرت کسی عورت کی خاطر ہو ان میں سے ہر ایک کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی اُس نے نیت کی ہے۔

یوں تو نماز بھی دوزخ کی کلید بن سکتی ہے۔ اگر اسی طرح فتویٰ دے کر لوگ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگیں تو کیا اس کی وجہ سے قانون جہاد کی حرمت کا فتویٰ صحیح ہوگا؟

ایک شبہ اور بھی ہے کہ سیونگ بینک میں تو نہیں لیکن عام بینکوں اور کواپریٹو بینکوں کے مالکوں میں بعض بعض مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا؟ یہ صحیح ہے کہ بینک کا کاروباری عملہ جس سے لوگ لین دین کرتے عموماً غیر اقوام کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن مالکوں کی جماعت میں جب مسلمان بھی ہیں تو عمل کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

کاش علماء غور کرتے۔ مسئلہ جو ائز السلاطین میں فقہاء نے کیا لکھا ہے؟ بہرحال میری غرض کچھ نہیں۔ صرف ایک مسئلہ کے متعلق علماء کو چونکانا ہے۔ یا تو وہ انسداد سُود کے لیے ایسی آواز بلند کریں جیسی کہ "مانع مسکرات" کی سوسائٹی نے بلند کی ہے۔ یا کم از کم قانونی حدود میں رہ کر اتنا تو کریں جتنا گائے والے کرتے ہیں۔ شاید حکو توجہ کرے یا وطن والے کچھ رحم کھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ "سُود" کا تصفیہ قربانی گاؤ کی قربانی سے ہو جائے۔ ورنہ پھر سرمایہ دار مسلمانوں کو کسی باضابطہ نظام کے تحت اس پر آمادہ کیا جائے کہ جو سلوک غیر اقوام کے لوگ غریب مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں وہی وہ دوسروں کے ساتھ کریں۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جتنی کہ اُس نے کی۔

مقصد صرف اس قدر ہے۔ ورنہ جو لوگ محض شکم پروری یا دولت مندی کے لیے اس مسئلہ کے جواز کی فکر میں ہیں اور اس فکر میں اتنے دیوانے ہو رہے ہیں کہ صحیح، غلط، جس طرح بن پڑتا ہے قرآن کے ایک منصوص حکم کے توڑنے میں زور لگا رہے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کی بنیاد امارۃ و دولت پر نہیں بلکہ جس کا فخر "فقر تھا" اسی حقیقتِ مقدسۂ کبریٰ نے اس کے ستون قائم کیے ہیں۔ بلندی صرف

ایمان کے ساتھ ہے۔ انتم الاعلون کا وعدہ محض "ان کنتم مومنین" کے ساتھ مشروط ہے ثروت دولت والے پہلے بھی وہی تھے جو اب ہیں اس وقت بھی قرآن کی یہی ہدایت تھی۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔

پھر ان کے اموال اور اولاد (مردم شماری) تم کو پسندیدہ نہ معلوم ہوں۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے انہیں دُکھ پہنچائے اور ان کی جان فرسودہ ہو کر نکلے ایسی حالت میں کہ وہ ناشکرے ہوں۔

اور اب بھی ہم مسلمانوں کے لیے اسی حکم میں قوت ہے۔ ہم اُمتیوں کو کیا، خود ہمارے پیشوا و سردار آقا و امام صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔

اور اپنی آنکھیں ان کی طرف اونچی نہ کرو جنہیں میں نے قسم قسم کی تازگی دے رکھی ہے۔ میں اس میں انہیں آزماتا ہوں۔ تیرے رب کی روزی تیرے لیے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

آج جو یورپ کے خداؤں کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہے ہیں کہ ہمارے لیے بھی اس قسم کے "الٰہ" ہونے چاہئیں کیا ان کو یہ سنایا نہ جائے کہ تم جس کی اُمت کے لیے روتے ہو، اس نے ارشاد فرمایا اور قسم کھا کر فرمایا۔ بخاری میں ہے :-

فَوَاللّٰهِ مَا اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ اَخْشٰى اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ۔ (بخاری)

پس قسم خدا کی میں فقر یا افلاس سے تمہارے لیے نہیں ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا پھیلائی جائے گی جس طرح تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی پھر جس طرح

انہوں نے اس میں باہم رشک وتنافس کیا۔ اسی طرح کہیں تم بھی نہ کرو اور تم بھی غافل نہ ہو جاؤ جس طرح وہ ہوئے۔

تم کہتے ہو کہ مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے، گنیاں نہیں ہیں، عمدہ کوٹ نہیں ہیں، عمدہ کپڑے نہیں ہیں، یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ لیکن مسلمان جن کے ہیں انہوں نے جو فرمایا ہے، دیوانو! اس کی تمہیں خبر بھی نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا، بخاری میں ہے:۔

تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَالْقَطِيْفَةِ وَالْخَمِيْصَةِ۔

اشرفیوں اور روپوں والے جھالردار لباس والے سیاہ عبا والے سب گرے، ہلاک ہوئے۔

تم کہتے ہو کہ مفلس قوم تباہ ہوئی جاتی ہے۔ لیکن جس کی قوم ہے وہ فرماتا ہے کہ درہم ودینار کے بندے تباہ ہوئے۔ اب تمہیں بتاؤ کہ ہم مسلمان کس کی سنیں؟ اور سچ ہے کہ جس قوم میں افلاس کا رونا ہے انہوں نے جب سود کھایا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا، تیرہ تیرہ برس کے اندر بائیس بائیس روپیہ کو بائیس بائیس لاکھ روپیہ تک بنا کر رہے ہے ان کے افلاس کے مرثیہ خوانوں کو دنیا میں کیا کمی ہے۔ کیا دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا اسی قوم کو پہنچ جاتا ہے جو سود کے میدان میں بازی مارے ہوئے ہے؟ فی کس تین پیسے کن قوموں کی آمدنی ہے؟ اور ان کو تو جانے دو، حکومت کے زور سے جو سود کھا رہے ہیں ان کے مزدوروں کا حال اخبارات میں کیا تمہاری نظروں سے نہیں گزرتا ہے، سچ فرمایا اُمّت کے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ (وفی روایۃ) عَيْنَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ۔

(بخاری)

اگر آدم کے بچوں کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تلاش میں مصروف ہوگا اور آدم کے بچے کا پیٹ (یا آنکھ) مٹی کے سوا

کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

پس ؎

سر منزل قناعت نتواں ز دست دادن

اے ساربان فرو کش کیں رہ کراں ندارد!

مسلمان کے لیے تو وہی نغمہ کافی ہے جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر گایا گیا۔

اللّٰھم لاعیش الّاعیش الاٰخرۃ۔

(ترجمان القرآن۔ شعبان ۵۵ھ۔ رمضان ۵۵ھ

(نومبر ۳۶ء۔ دسمبر ۳۶ء

تنقید

(از:۔ ابوالاعلیٰ مودودی)

مجھ کو مولانا مناظر احسن صاحب کی رائے سے جن جن امور میں اختلاف تھا، ان کا اظہار مختصر طور پر حواشی میں کر دیا گیا ہے۔ لیکن جن اصولی مسائل پر مولانا نے اپنے استدلال کی بنا رکھی ہے ان پر روشنی ڈالنے کے لیے محض اشارات کافی نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ مفصل تنقید لکھی جا رہی ہے۔ مولانا کے استدلال کی بنا حسب ذیل امور پر ہے۔

مولانا کے دلائل کا خلاصہ

(۱) ان کا دعویٰ ہے کہ نہ صرف تحریم ربوٰ کا حکم، بلکہ تمام عقودِ فاسدہ اور ناجائز معاشی وسائل کی ممانعت کے احکام بھی صرف اُن معاملات سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہوں۔ بالفاظ دیگر غیر قوموں کے ساتھ جو معاملات پیش آئیں ان میں حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں۔

(۲) ان کے نزدیک شریعت نے تمام اُن غیر مسلموں کو مباح الدم والاموال قرار دیا ہے جو ذمی نہ ہوں، لہٰذا ایسے غیر مسلموں کا مال جس طریقہ سے بھی لیا جائے جائز ہے عام اس سے کہ وہ سود ہو، یا قمار ہو، یا ان کے ہاتھ شراب اور لحم خنزیر اور مردار فروخت کیا جائے یا اور دوسرے وہ طریقے اختیار کیے جائیں جنہیں اسلام نے "مسلمانوں کے معاملہ میں" اختیار کرنے کو حرام ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کے معاملہ میں"

اختیار کرنے کو حرام ٹھہرایا ہے۔ مسلمان جس طرح بھی ان کا مال لیں گے، اس کی حیثیت مال کی غنیمت یا فے کی ہو گی۔ اور وہ ان کے لیے حلال وطیب ہے۔

(۳) ان کی رائے میں ہر وہ ملک جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے دارالحرب ہے اور اس کے غیر مسلم باشندے حربی ہیں۔ وہ دارالکفر کو دارالحرب کا اور کافر غیر ذمی کو حربی کا ہم معنیٰ سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک تمام وہ ممالک جن پر غیر اسلامی سلطنتیں قابض ہیں پورے معنوں میں دارالحرب ہیں، اور وہاں علی الدوام وہی احکام مسلمانوں پر جاری رہنے چاہئیں جو دارالحرب کے متعلق کتب فقیہہ میں مذکور ہیں۔

(۴) دارالحرب کی جو تعریف فقہائے متقدمین نے کی ہے وہ مولانا کی رائے میں ہندوستان پر چسپاں ہوتی ہے اور اس ملک کے مسلمانوں کی فقہی پوزیشن اُن کی رائے "مستامن" کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان اس دارالحرب میں اس حیثیت سے رہتے ہیں کہ اُنہوں نے یہاں کی حربی سلطنت سے امان لی ہے۔

(۵) مستامن کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اُس غیر اسلامی سلطنت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جس سے امان لے کر وہ اس کے ملک میں رہتا ہو۔ لہٰذا مولانا کی رائے ہندوستان کے مسلمانوں پر غیر اسلامی حکومت کے قانون کی اطاعت تو ایسی فرض ہے کہ اگر یک سر مو اس سے انحراف کریں گے تو عذاب جہنم کے مستحق ہوں گے۔ لیکن اسلام کے اکثر احکام اور قوانین کی اطاعت سے وہ بالکل آزاد ہیں، اس لیے کہ وہ دارالحرب میں مقیم ہیں۔ قتل، غارت گری، چوری، ڈکیتی، رشوت ٹھگی اور ایسے ہی دوسرے ذرائع سے حربی کفار کو نقصان پہنچانا اور ان کا مال لینا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صرف اس وجہ سے ناجائز ہے کہ ملکی قانون ان کو ناجائز کہتا ہے، نہ اس لیے کہ یہ افعال بجائے خود اسلامی شریعت میں حرام ہیں کیونکہ تمدن اور معیشت اور اخلاق کے بیشتر معاملات میں ہندوستان کے اندر اسلامی شریعت اُس وقت تک منسوخ ہے جب تک یہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے۔ اب شریعت کے قوانین میں سے صرف قانونِ معاہدہ کا اطلاق یہاں کے مسلمانوں پر

ہوتا ہے، اور اس کی رُو سے لین دین اور کسب مال کے جو ذرائع ملکی قانون میں ناجائز ہیں ان کو اختیار کرنا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے شرعاً حرام ہے، بخلاف اس کے جن ذرائع کو شریعت نے حرام ٹھہرایا ہے اور ملکی قانون حلال ٹھہراتا ہے وہ سب کے سب قانوناً بھی حلال ہیں اور شرعاً بھی حلال، نہ دنیا میں ان پر کوئی تعزیر، نہ آخرت میں کوئی مواخذہ۔

دلائل مذکورہ پر مجمل تبصرہ

میرے نزدیک ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں۔ خود حنفی قانون بھی، جس کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا نے یہ تمام تقریر فرمائی ہے، ان بیانات کی تائید نہیں کرتا۔ اس مضمون میں مولانا نے اسلامی قانون کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ صرف غلط ہی نہیں بدنما بھی ہے۔ اس کو دیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہرگز کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی ناواقف شخص اس تصویر کو دیکھے گا تو وہ اسلام کو دنیا کا بدترین مذہب اور مسلمانوں کو ایک نہایت خطرناک قوم سمجھے گا، اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ غیر مسلم حکومت کے قانون نے ان "مستامنوں" کے ہاتھ سے دوسری قوموں کی جان و مال اور آبرو کو بچا رکھا ہے۔ دوسری طرف اگر شریعت کی اسی تعبیر کو قبول کر کے ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں زندگی بسر کرنا شروع کردیں تو شاید پچاس برس کے اندر اُن میں برائے نام بھی اسلام باقی نہ رہے۔ بلکہ اگر خدانہ کردہ کفار کے تسلّط کے آغاز سے ہندوستان میں انہی اصولوں پر عملدرآمد کیا گیا ہوتا تو آج جو کچھ رہی سہی اسلامیت ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے۔ یہ بھی نہ ہوتی اور ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان کے مسلمان بالکل مسخ ہوچکے ہوتے ——— البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ ان کی جائدادوں کا ایک حصّہ محفوظ رہ جاتا اور ان میں بھی مارواڑیوں اور بنیوں اور سیٹھوں کا ایک طبقہ پیدا ہوجاتا۔

حاشا وکلا، میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا نے بالقصد اسلام کی غلط نمائندگی کی ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ انہوں نے قانونِ اسلامی کو جیسا کچھ سمجھا ہے غایت درجہ

دیانت اور نیک نیتی کے ساتھ ویسا ہی ظاہر فرما دیا ہے۔ مگر مجھے اعتراض دراصل ان کے مفہوم اور ان کی تعبیر ہی پر ہے۔ میں نے قانونِ اسلامی کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ خاص اُن مسائل کی حد تک جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، مولانا نے شریعت کے اصول اور احکام کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا ہے۔ اس غلط فہمی کے دو وجوہ قرینِ قیاس ہیں۔

اوّلاً، آئمہ مجتہدین نے جس زمانہ میں سلطنتِ اسلامی کے دستوری قانون (Constitutional Law) اور بین الاقوامی معاملات کے متعلق کتاب وسُنّت کی ہدایات اور خود اپنے اجتہاد سے یہ احکام مدوّن کیے تھے، اس زمانہ میں فقہاء کی حیثیت محض اصحابِ درس وتدریس ہی کی نہ تھی بلکہ وہی سلطنت کے قانونی مشیر اور عدالتوں کے صدر نشین بھی تھے۔ رات دن اسلامی سلطنت میں نئے نئے دستوری اور بین الاقوامی مسائل پیش آتے تھے اور ان میں انہی بزرگوں کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ہمسایہ قوموں سے جنگ وصلح کے معاملات ہوتے رہتے تھے، اسلامی سلطنتوں کی رعایا کے درمیان معاملات اور تعلقات کی گوناگوں صورتیں پیش آتی تھیں اور ان سے جو قانونی مسائل پیدا ہوتے تھے ان کا تصفیہ کرنے والے یہی حضرات تھے۔ یہ لوگ اپنے فیصلوں اور تجویزوں میں جو قانونی اصطلاحات وعبارات استعمال کرتے تھے، ان کے مفہومات کا تعین محض لفظی تشریحات پر منحصر نہ تھا، بلکہ ان کی اصلی شرح وہ واقعی حالات تھے جن پر یہ اصطلاحات وعبارات منطبق ہوتی تھیں۔ پس اگر کسی اصطلاح یا عبارت میں کوئی ابہام رہ جاتا، یا ایک چیز کے مختلف مدارج پر ایک ہی اصطلاح استعمال کی جاتی اور ظاہر الفاظ میں فرقِ مدارج پر دلالت کرنے والی کوئی چیز نہ ہوتی، یا ایک وسیع مفہوم پر ایک لفظ بولا جاتا اور صرف موقع و محل کے لحاظ سے اس کے مختلف مفہومات میں تمیز ہوتی، تو اس سے عملاً قانون کے انطباق اور استعمال میں کوئی قباحت واقع ہونے کا خطرہ نہ ہوتا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی قانون داں شخص کسی حکم کو محض الفاظ کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے بالکل مختلف

صورتِ حال پر چسپاں کر دے گا۔ اس لیے کہ اُس وقت اسلامی قانون کی اصطلاحات اور مخصوص قانونی عبارات کی حیثیت رائج الوقت سکّوں کی سی تھی۔ عملی دنیا میں ان کا چلن تھا۔ ان کے مفہومات کو سمجھنے اور ٹھیک موقع پر استعمال کرنے اور ہر ایک کی صحیح حد معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ ہر قانون داں شخص کو شب و روز اُن حالات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دوچار ہونا پڑتا تھا جن میں یہ زبان برتی جاتی تھی۔ مگر اب ایک مدت سے وہ صورتِ حال مفقود ہے۔ دستوری مسائل اور بین الاقوامی معاملات سے بالفعل علماء کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اسلامی سلطنتیں مٹ گئیں اور جو سلطنتیں باقی ہیں ان میں بھی یہ مسائل علمائے شریعت سے متعلق نہیں ہیں۔ عملی دنیا میں اسلامی قانون کی اصطلاحات و عبارات کا چلن بھی مدتوں سے بند ہو چکا ہے۔ اب یہ پرانے تاریخی سکّے ہیں جن کی قیمت کا وہ حال نہیں کہ رواج کی وجہ سے بازار میں ہر آدمی کے لیے وہ ایک جانی پہچانی چیز ہو، بلکہ اُن کی پرانی قدر رائج (Market value) —— معلوم کرنے کے لیے پُرانے ریکارڈوں کی چھان بین کرنا اور زمانۂ حال کے عملی برتاؤ پر قیاس کر کے اُس زمانے کے واقعی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک مسائل سیاسی و دستوری کا تعلق ہے فقہ اسلامی کے احکام کو سمجھنا، مسائلِ نکاح و وراثت وغیرہ کو سمجھنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ خصوصاً جہاں ہماری کُتب فقہ میں عبارات مبہم رہ گئی ہیں یا اصطلاحات میں توسع پایا جاتا ہے وہاں علماء کے لیے قانون کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی صحیح تعبیر کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اب ان کے صرف

---

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال مولانا ہی کے مضمون میں اوپر گزر چکی ہے، جہاں انہوں نے شامی کی ایک عبارت نقل کر کے یہ حکم بیان کیا ہے کہ سمندر پورے کے پورے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر اسلامی مقبوضہ ہیں۔ جس زمانہ میں ابتداءً کسی مجتہد نے یہ بات لکھی تھی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ درست ہوگی۔ لیکن بعد کے لوگوں نے جب اگلوں کی (باقی حاشیہ ص ۲۸۶ پر)

الفاظ ہی الفاظ رہ گئے ہیں، کتابوں کے متون بھی لفظی ہیں اور ان کی شروح بھی لفظی۔

دوسری وجہ جس کی طرف خود مولانا نے بھی اشارہ کر دیا ہے، یہ ہے کہ گزشتہ صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمانوں پر جو معاشی تباہی مسلط ہو گئی ہے، اور جس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کروڑوں اور اربوں روپے کی جائدادیں کوڑیوں کے مول نکل گئی ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے بڑے بڑے خوش حال گھرانے روٹیوں کو محتاج ہو گئے ہیں، اس کو دیکھ دیکھ کر ہر دردمند مسلمان کی طرح مولانا کا دل بھی دُکھا ہے اور انہوں نے غایت درجہ دل سوزی کے ساتھ کوشش کی ہے کہ شریعت میں اس مصیبت کا کوئی حل تلاش کریں۔ اس جذبہ کے اثر سے اکثر مقامات پر ان کا قلم اعتدال اور فقیہانہ احتیاط سے ہٹ گیا ہے۔ مثلاً ان کا یہ ارشاد کہ ہندوستان میں سُود نہ لینا گناہ ہے، یا یہ بیان کہ عقودِ فاسدہ کی ممانعت کے جملہ احکام صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک محدود ہیں۔ جہاں تک مسلمانانِ ہند کے موجودہ رُوح فرسا حالات کا تعلق ہے کون مسلمان ایسا ہوگا جس کا دل ان کو دیکھ کر نہ دُکھتا ہو، اور کون اس کا خواہش مند نہ ہوگا کہ ان مصائب سے مسلمان نجات پائیں۔ اس باب میں ہمارے اور ان کے درمیان ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں۔ مگر میں یہ ماننے سے قطعی انکار کرتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی تباہی کسی حیثیت سے بھی، بالواسطہ یا بلاواسطہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۵ سے) کتابوں میں یہ بات لکھی پائی تو تقلیداً اسے اسلامی قانون کا مستقل فیصلہ سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ سمندر بین الاقوامی تعلقات کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور کوئی طاقت عالمگیر اثر و اقتدار کی مالک نہیں ہو سکتی جب تک سمندروں پر اس کا اقتدار نہ ہو۔ اگر اسلامی فقہ کا پڑھنا پڑھانا صرف مدرسوں تک محدود نہ ہوتا اور علماء کا عملی تعلق دنیا کی سیاست سے رہتا تو وہ محسوس کر سکتے تھے کہ سمندروں سے کفار کے حق میں خود دستبردار ہو جانا اور اپنے لیے خشکی میں سمٹ رہنے کا آپ ہی فیصلہ کر لینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

سُود نہ کھانے کی وجہ سے ہے، اور اس حالت کا بدلنا سُود کی تحلیل پر موقوف ہے۔ بلکہ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ تحریمِ سُود کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی مسلمانوں کی معاشی ترقی میں مانع ہے۔ جو شخص يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ پر ایمان رکھتا ہو، اور جو اس ارشادِ ربانی کو معاش اور معاد دونوں میں ایک اٹل حقیقت سمجھتا ہو، اس کو کبھی اس کو کبھی اس قسم کے شبہات میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔ اگر مولانا غور فرمائیں گے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی معاشی تباہی کا اصلی سبب سود نہ کھانا نہیں ہے، بلکہ سُود کھلانا اور ادائے زکوٰۃ سے جی چُرانا، اور اسلامی نظمِ معیشت کو بالکل معطل کر دینا ہے۔ جن گناہوں کی سزا مسلمانوں کو مل رہی ہے وہ دراصل یہی ہیں۔ اگر وہ ان گناہوں پر قائم رہے اور اس پر سُود خواری کا اضافہ اور ہو گیا تو ممکن ہے کہ چند افرادِ قوم پر مالی آماس چڑھ جائے اور اس سے چند سیدھے سادے مسلمان دھوکہ کھا جائیں، لیکن درحقیقت اس سے بحیثیتِ مجموعی قوم کی معاشی حالت میں کوئی اصلاح نہ ہو گی اور دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی حالت اور ان کی باہمی الفت و مؤانست اور ان کے تعاطف و تراحم اور تعاون و تناصر میں شدید انحطاط رونما ہو گا یہاں تک کہ ان کی قومیت مضمحل ہو جائے گی۔

آپ سُود کا نام "بیاؤ" رکھ دیجیے یا اُسے مَائِدَةٌ مِّن السَّمَاءِ کہہ کر پکاریئے، اس کی حقیقت اور فطری خاصیت میں بال برابر بھی تغیر واقع نہ ہو گا۔ سُود اپنی عین فطرت کے لحاظ سے زکوٰۃ کی ضد ہے اور اس نفسیاتی حقیقت میں کسی ملک کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی معاشی زندگی میں یہ دونوں جمع ہو جائیں۔ ایک وہ ذہنیت ہے جس کو روپیہ گننے اور گن گن کر سنبھالنے، اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بڑھانے، اور اس کو بڑھوتری کا حساب لگانے میں مزا آتا ہے۔ دوسری وہ ذہنیت ہے جس کو قوتِ بازو سے کمانے اور کما کر کھانے اور کھلانے اور راہِ خدا پر لٹا دینے میں مزا آتا ہے۔ کیا کوئی عاقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ دونوں ذہنیتیں ایک ہی دل و دماغ میں جمع ہو سکیں گی؟ یا یہ

اُمید کی جا سکتی ہے کہ مسلمان کو سُود پر روپیہ لگانے اور یوماً فیوماً اس کے نشوونما پر نظر رکھنے کا چسکا لگ جائے گا تو اس کے بعد بھی اس کی جیب سے زکوٰۃ و صدقات کے لیے ایک پیسہ نکل سکے گا؟ کیا اس کے بعد بھی کوئی مسلمان کسی مسلمان کو قرضِ حسن دینا گوارا کرے گا؟ کیا اس کے بعد مسلمانوں کی حالت بھی اُس قوم کی سی نہ ہو جائے گی جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً[1] اور وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ[2]؟ چند قارون اور چند شائلاک پیدا کرنے کے لیے پوری قوم آخر کیوں خودکشی کرے؟ اور اس خودکشی کو جائز ثابت کرنے کے لیے خدا اور رسولؐ کے قانون کی غلط تاویل کیوں کی جائے؟ اور امام اعظم ابوحنیفہ رح النعمان جیسے بزرگ کو اس ذمہ داری میں کیوں شریک کیا جائے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ دُنیا میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو تیرہ سو برس سے نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت پر قائم ہے اور جس نے عملاً اس فاسد نظام کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس قوم کو جو چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظامِ سرمایہ داری کی عداوت پر قائم رکھنے والی اور اس میں جذب ہونے سے بچانے والی ہے وہ زکوٰۃ کی فرضیت اور سُود کی تحریم ہی ہے۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ اور نہلسٹ سب سرمایہ دار سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، مگر جب تک یہ دو زبردست رکاوٹیں قائم ہیں، مسلمان کبھی اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وہ قومیں نظامِ سرمایہ داری میں جذب ہو گئیں جن کے مذہب نے سُود سے منع کیا تھا، مگر مسلمان تیرہ صدیوں سے اس کے مقابلے میں جما ہوا ہے۔ اب کہ خود دنیا والوں میں بھی بصارت پیدا ہو رہی ہے اور وہ اس نظام کو مٹانے کے لیے فوج در فوج جمع ہو رہے ہیں، یہ کیسی بدبختی ہو گی کہ مسلمان خود میدانِ مقابلہ

---

[1] پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے اور ان کا حال یہ ہو گیا کہ وہ پتھر کی طرح بلکہ اس سے زیادہ سخت ہیں۔

[2] تم ان کو سب سے بڑھ کر زندگی کا حریص پاؤ گے۔

سے ہٹ جائے اور اپنے ہاتھوں اپنے قلعہ کے مستحکم بُرجوں کو مسمار کرکے نظامِ سرمایہ داری کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانے لگے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم اصل قانونی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کیا عقودِ فاسدہ صرف مسلمانوں کے درمیان ممنوع ہیں

مولانا کے پہلے دعوے کی بنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کسب مال کے ناجائز ذرائع سے روکا گیا ہے وہاں "بَيْنَكُمْ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں عقودِ فاسدہ پر معاملات نہ کیا کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: ۲۹) اب یہ ظاہر ہے کہ سُود بھی کسبِ مال کے ناجائز طریقوں میں سے ایک طریقہ ہی ہے۔ لہٰذا قرآن میں اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا جو فرمایا گیا ہے، یہ بھی اگرچہ ظاہر الفاظ کے لحاظ سے عام حکم ہے، مگر جس اصل کی فرع ہے اس کے ساتھ بالتبع اس کو بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک ہی محدود سمجھنا چاہیے۔ اس کی مزید تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو مکحول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ "لا ربٰو بین المسلم والحربی"، یعنی مسلمان اور حربی کافر کے درمیان تفاضل کے ساتھ جو لین دین ہو اس پر لفظ "سود" کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔ بالفاظِ دیگر لاربٰو کے معنی یہ ہیں کہ غیر ذمّی کافر سے جو سُود لیا جائے وہ سُود ہی نہیں۔ پھر وہ حرام کیسے ہوا؟

یہ مولانا کے استدلال کا خلاصہ ہے۔ اس میں پہلی اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ قرآن کے مقاصد سے قطع نظر کرکے صرف ظاہر الفاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کا عام اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنی ہدایتیں دیتا ہے ان میں صرف اہلِ ایمان کو مخاطب کرتا ہے، اور ان سے کہتا ہے کہ تم آپس میں ایسا کیا کرو یا نہ کیا کرو۔ اس طرزِ بیان میں کچھ دوسری حکمتیں ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اس قسم کے اندازِ بیان میں اخلاق اور معاملات

کے متعلق جتنے احکام اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں، ان کو فقہائے امت میں سے کسی نے بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک محدود قرار نہیں دیا ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان جو افعال حرام ہیں مسلمان اور کافر کے درمیان وہی حلال یا مستحب ہیں۔ اگر ایسا ہو تو درحقیقت اسلامی اخلاقیات اور اسلامی قانون تمدن کی جڑ ہی کٹ جائے۔ مثلاً:۔

ارشاد باری ہے وَلَا تَتَّخِذُوٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ (النحل: ۹۴) کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ مسلمان صرف مسلمان سے جھوٹی قسم نہ کھائے؟ رہے غیر مسلم تو ان سے دروغ حلفی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں؟

فرمان الٰہی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ (انفال: ۲۷) کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان صرف اُن امانتوں کی حفاظت کریں جو مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہوں؟ باقی رہی کافر کی امانت تو اس میں بے تکلف خیانت کر ڈالی جائے؟

پھر یہ جو فرمایا فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (بقرہ۔ ۲۸۳) کیا اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ مسلمان کے بجائے کوئی کافر اگر کسی مسلمان پر بھروسہ کر کے بغیر لکھا پڑھی کیے اپنا کچھ مال اس کے پاس رکھوا دے تو وہ "بیاؤ" سمجھ کر اس کو کھا سکتا ہے؟

پھر یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ اور وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) تو کیا یہ سب احکام صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات ہی کے لیے ہیں؟ کیا کافر کے حق میں شہادت دینے سے انکار کرنا، یا سچی شہادت چھپا کر جھوٹی شہادت دینا یا دستاویز کے غیر مسلم کاتب یا گواہ کو خوفزدہ کرنا یہ سب جائز افعال ہیں؟

اس کے بعد یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ

فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (النور: ۱۹) تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ غیر قوموں کے اندر فحش اور بدکاری پھیلانا مسلمان کے لیے جائز ہے؟

اور یہ جو فرمان ہوا اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (النور: ۲۴) تو کیا اس کی یہی تاویل کی جائے گی کہ کفار کی عورتوں پر جھوٹی تہمتیں دل کھول کر لگاؤ۔

اور یہ جو ارشاد ہوا کہ وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (النور: ۳۳) تو اس کو یہ معنی پہنائے جائیں گے کہ کافر عورتوں کو حرام کاری پر مجبور کرنا اور ان کی خرچی کھانا جائز ہے؟ کیا اس طرح کی تاویل کر کے کسی مسلمان کے لیے حلال ہو گا کہ پیرس میں سرکاری لائسنس لے کر ایک قحبہ خانہ کھول دے؟

پھر یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ۔ (الحجرات: ۱۲) تو کیا اس کی یہ تاویل ہو گی کہ صرف مسلمان کی غیبت ناجائز ہے؟ باقی رہا کافر تو اس کی غیبت کرنے میں کوئی برائی نہیں؟

اگر اسی اصول پر قرآن اور سنت کے احکام کی تاویل کی جائے اور مسلمان اسی کا اتباع شروع کر دیں تو اندازہ فرمائیے کہ یہ قوم کیا سے کیا بن کر رہے گی۔

بالفرض اگر بلا دلیل یہ مان لیا جائے کہ صرف لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ہی کا حکم مسلمانوں کے باہمی معاملات کے لیے مخصوص ہے اور یہ قاعدہ دوسرے احکام میں جاری نہ ہو گا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ذمی کافروں کو سودی لین دین سے کیوں روکا گیا؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم جماعتوں سے اس قسم کے معاہدات کیوں کیے کہ وہ سودی کاروبار چھوڑ دیں ورنہ معاہدہ کالعدم ہو جائیگا؟ اور کتب فقیہہ میں یہ تصریح کیوں ہے کہ اگر کوئی حربی کافر دارالاسلام میں امان لے کر

آئے تو اس سے بھی سُود پر معاملہ کرنا حرام ہے ؟

رہی حدیث لَا رِبٰو بَیۡنَ الۡمُسۡلِمِ وَالۡحَرۡبِیِّ، تو اوّلاً اس میں لفظ حربی سے مراد محض غیر ذمّی کافر نہیں بلکہ بر سرِ جنگ قوم کا فرد ہے جیسا کہ خود فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے آگے چل کر ثابت کیا جائے گا۔

ثانیاً لاربٰو کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حربی کافر سے جو سُود لیا جائے گا وہ سود ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گو وہ صورۃً حقیقۃً سُود ہی ہے، لیکن ہم قانون میں حرمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس کی حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ گویا وہ سُود نہیں ہے۔ ورنہ کسی سُود کو یہ کہنا کہ وہ سُود ہے ہی نہیں، اس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسے منسوب کرنے کو میں گناہ سمجھتا ہوں۔ یہ بالکل ایک معقول بات ہے کہ کسی خاص حالت میں سُود کو تعزیر اور حرمت سے مستثنیٰ کر دیا جائے، جس طرح خود قرآن نے اضطرار کی حالت میں مردار اور سُور اور ایسی ہی دوسری حرام چیزیں کھا لینے کو مستثنیٰ کیا ہے لیکن یہ ایک نہایت غیر معقول بات ہے کہ سُود کی حقیقت جُوں کی تُوں باقی ہو اور ہم ایک جگہ اس کو ربٰو کہیں اور دوسری جگہ سرے سے اس کے ربٰو ہونے ہی سے انکار کر دیں۔ اس طرح تو دنیا کے ہر فعلِ حرام کو محض تغیرِ اسم سے حلال کیا جا سکتا ہے۔ جس خیانت کو جی چاہے کہہ دیجیے کہ یہ خیانت ہی نہیں۔ جس جھوٹ کو جائز کرنا ہو کہہ دیجیے کہ اس پر لفظ جھوٹ کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ جس غیبت اور فحش اور حرام خوری کی طرف طبیعت مائل ہو اس کا نام بدل کر سمجھ لیجیے کہ اس کی حقیقت بدل گئی۔ سرکار رسالت مآبؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اس سے بہت بلند تھا کہ آپ اس قسم کے لفظی حیلے اپنی اُمت کو سکھاتے۔

ثالثاً اس حدیث میں جو حکم بیان ہُوا ہے اس کی حیثیت محض ایک رخصت اور رعایت کی ہے، نہ یہ کہ اس کو مسلمانوں کا عام دستور العمل بنانا مقصود ہو ——— میں اس بحث کو بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے کیونکہ حدیثوں

کے ردّ و قبول میں فقیہ کے اصول محدث کے اصول سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ امام اعظم اور امام محمد جیسے آئمہ مجتہدین نے جس حدیث کو قابل استناد سمجھا ہو اس کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دینا درست نہیں۔ مگر اس مختصر اور غیر واضح اور مختلف فیہ[1] خبر واحد کو اتنا پھیلانا بھی درست نہیں کہ قرآن اور حدیث اور آثار صحابہ کی متفقہ شہادت ایک طرف ہو اور دوسری طرف یہ حدیث ہو، اور پھر اس ایک حدیث کی تاویل ان سب کے مطابق کرنے کے بجائے، اُن سب کو اس ایک حدیث پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن اور تمام احادیث صحیحہ میں مطلقاً ربٰو کو حرام کہا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان نہ آپس میں اس کا لین دین کر سکتے ہیں نہ غیر قوموں کے ساتھ ایسا کاروبار کرنا ان کے لیے جائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نہ صرف خود سُودی لین دین سے پرہیز کریں گے بلکہ جن جن غیر مسلموں پر ان کا بس چلے گا ان کو بھی بجبر اس فعل سے روک دیں گے۔ تحریم ربٰو کے بعد ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت سے کسی مسلمان نے کسی ذمّی یا غیر ذمّی کافر کے ساتھ سودی معاملہ کیا ہو۔ خلفاء راشدین کے دَور میں بھی اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ بات صرف سود ہی پر موقوف نہیں، عقود فاسدہ میں سے کوئی ایک عقد فاسد بھی ایسا نہیں جس کی تحریم کا حکم نازل ہو جانے کے بعد نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے انعقاد کی کسی مسلمان کو اجازت دی ہو۔ نظری اور اصولی اہل حرب تو درکنار، جو لوگ عملاً برسرِ جنگ تھے، انہوں نے عین معرکۂ جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عقد فاسد پر معاملہ کرنا چاہا اور کافی رقم پیش کی مگر آپؐ نے اس کو لینے سے انکار

---

[1] یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ امام ابو یوسف، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اکثر اصحاب حدیث نے اس روایت کو ردّ کر دیا ہے۔

کر دیا۔ ایک طرف آیت قرآنی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صریح و صحیح اقوال اور عہدِ نبوی کا ثابت شدہ عمل در آمد ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف سُود بلکہ تمام عقود فاسدہ مطلقاً ناجائز ہیں اور اس میں مسلم و غیر مسلم یا حربی یا ذمی کا کوئی امتیاز نہیں۔ دوسری طرف صرف ایک مُرسل حدیث ہے جو ان سب کے خلاف حربی اور مسلم کے درمیان صرف سُود کو حلال ثابت کر رہی ہے۔ آپ نے اس حدیث کو اتنی اہمیت دی کہ اس کی بنیاد پر نہ صرف سُود کو بلکہ تمام عقود فاسدہ کو تمام غیر ذمی کفار کے ساتھ عمومیت کے ساتھ حلال کر ڈالا۔ مگر ہم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سے صرف اتنی اجازت نکالتے ہیں کہ جنگ کی اضطراری حالتوں میں اگر کوئی مسلمان دشمن سے سُود دے لے یا کسی اور عقد فاسد پر معاملہ کر لے تو اس سے مواخذہ نہ ہو گا۔

لہ یہ واقعہ غزوۂ خندق کا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ اس کے راوی ہیں ــــــ مشرکین میں سے ایک بڑے آدمی کی لاش خندق میں گر پڑی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو روپیہ دے کر وہ لاش ان سے خرید لینی چاہی۔ مسلمانوں نے حضورؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا (کتاب الخراج لامام ابی یوسف۔ طبع امیریہ ص ۱۲۳)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنگ کے موقع پر مسلمان کو دشمنوں سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کی اجازت دی بھی گئی ہے تو وہ کراہت سے خالی نہیں اور یہ بات مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ شاید حالت اضطرار کے بغیر اس سے فائدہ اُٹھائے۔ اسی بات پر وہ واقعہ بھی دلالت کرتا ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے مکہ میں تحریم قمار سے پہلے مشرکین سے ایک شرط کی تھی۔ پھر اس کا روپیہ انہوں نے اس زمانہ میں ان سے وصول کیا جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حالتِ جنگ قائم تھی اور صرف عارضی التوائے جنگ ہُوا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی حلال و طیب نہیں ٹھہرایا اور صدیق رضؓ کو حکم دیا کہ اسے صدقہ کر دو۔

یہ محض ایک رخصت ہے اور ایسی رخصت ہے جس سے اولوالعزم مسلمانوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسلامی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کسی حال میں بھی حرام کی کمائی لینے پر آمادہ نہ ہو۔ خصوصاً کفار اور دشمنوں کے مقابلہ میں تو اس کو اپنے قومی اخلاق کی بلندی اور بھی زیادہ شان کے ساتھ ظاہر کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان کی لڑائی دراصل تیر و تفنگ کی نہیں اصول اور اخلاق کی لڑائی ہے۔ اس کا مقصد زر و زمین حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ دنیا میں اپنے صول پھیلانا چاہتا ہے۔ اگر اس نے اپنے مکارم اخلاق ہی کو کھو دیا، اور خود ہی ان اصولوں کو قربان کر دیا جن کو پھیلانے کے لیے وہ کھڑا ہوا ہے، تو پھر دوسری قوموں پر اس کی فوقیت ہی کیا باقی رہی؟ کس چیز کی بنا پر اس کو دوسروں پر فتح حاصل ہو گی اور کس طاقت سے وہ دلوں اور روحوں کو مسخر کر سکے گا؟

دارالحرب کی بحث

اب ہمیں دوسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے فرق کی بنیاد پر سود اور تمام عقود فاسدہ کے احکام میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اور اس بیان کی کیا اصلیت ہے کہ تمام غیر ذمی کافر مباح الدم والاموال ہیں اس لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لے لینا جائز ہے؟ اور اس تجویز کے لیے شریعت میں کیا گنجائش ہے کہ جس ملک پر کسی معنی میں اصطلاح دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہو وہاں کے باشندوں پر دائماً وہ تمام احکام جاری ہونے چاہئیں جو دارالحرب سے تعلق رکھتے ہیں؟

قانونِ اسلامی کے تین شعبے

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ شریعت یعنی قانونِ اسلامی کے تین شعبے ہیں:-

(۱) اعتقادی قانون جو علی الاطلاق تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے،

(۲) دستوری قانون جس کا تعلق صرف سلطنتِ اسلامی سے ہے،

(۳) بین الاقوامی قانون، یا صحیح الفاظ میں تعلقات خارجیہ کا قانون جو مسلمانوں اور غیر قوموں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے۔

ہماری کتب فقہیہ میں ان قوانین کو الگ الگ مرتب نہیں کیا گیا اور نہ اُن کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے، لیکن قرآن و حدیث میں ایسے واضح اشارات موجود ہیں جن سے قدرتی طور پر اسلامی قوانین کا ارتقاء تین الگ الگ راستوں پر ہوا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جس فقیہ اعظم کی قانونی بصیرت اور فقیہانہ دقیقہ سنجی نے سب سے بڑھ کر ان اشارات کو سمجھا اور ان کی بنا پر قانون کے ان تینوں شعبوں کی حدود میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کیا، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس امتیاز کو ملحوظ رکھا وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فقہائے اسلام میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ امام ابو یوسف جیسے بالغ النظر فقیہ کی رسائی بھی اس مقام تک نہ ہو سکی۔ امام اعظم کے کمال کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ۱۲ سو سال پہلے انہوں نے قرآن اور سنّت سے استنباط کر کے دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے جو احکام مدوّن کیے تھے، آج تک دنیا کے قانونی افکار کا ارتقاء ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ در اصل یہ ارتقاء ہوا ہی اُن خطوط پر ہے جو ۱۲ صدی قبل کوفہ کے ایک پارچہ فروش نے کھینچ دیئے تھے۔ فقہ حنفی کی بہ نسبت جدید زمانہ کے قوانین میں بظاہر جو ترقی نظر آتی ہے وہ کسی حد تک تمدنی احوال کے تغیر کا، اور زیادہ تر بین الاقوامی معاہدات کا نتیجہ ہے۔ تاہم اصولی حیثیت سے جدید زمانہ کے قوانین بڑی حد تک حنفی فقہ کا چربہ ہیں اور ان کے مطالعہ سے حنفی فقہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اعتقادی قانون

اعتقادی قانون کے لحاظ سے دنیا دو ملتوں پر منقسم ہے۔ اسلام اور کفر۔ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور تمام کفار دوسری قوم۔ اسلام کو ماننے والے سب کے سب اسلامی قومیت کے افراد ہیں اور اخوت دینی کی بنا پر سب کو ایک دوسرے پر حقوق

حاصل ہیں فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ[1] (توبہ: ۱۱) مسلمان کی جان، اس کا مال اس کی عزت ہر چیز مسلمان کے لیے حرام ہے۔ ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام[2] (حجۃ الوداع) اسلام کے جملہ احکام کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں بستا ہو، جو کچھ فرض کیا گیا ہے وہ سب کے لیے فرض ہے، جو کچھ حلال کیا گیا ہے سب کے حلال ہے، اور جو کچھ حرام ٹھہرایا گیا سب کے لیے حرام ہے۔ کیونکہ جملہ احکام کے مخاطب اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہیں، کسی حال اور مقام کی قید اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں کفر ایک دوسری ملت ہے جس سے ہمارا اختلاف اصول اور اعتقاد اور قومیت[3] کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر اصلاً ہمارے اور ان کے درمیان جنگ قائم ہے، اِلّا یہ کہ اس پر صلح یا معاہدہ یا ذمہ کی کوئی حالت عارض ہو جائے۔ پس اسلام اور کفر، اور مسلم اور کافر کے درمیان صلح اصل نہیں بلکہ جنگ اصل ہے اور صلح اس پر عارض ہوتی ہے۔ مگر یہ جنگ بالفعل نہیں بالقوہ ہے، عملی نہیں نظری اور اصولی ہے اس کے معنی

---

[1] پھر اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

[2] تم پر ایک دوسرے کے خون اور اموال اور عزتیں حرام ہیں۔

[3] واضح رہے کہ اس جگہ ہم "قومیت" کا لفظ نسلی اور وطنی قومیت کے معنی میں نہیں بلکہ تہذیبی قومیت کے معنی میں بول رہے ہیں، اور تہذیبی قومیت ہی پر اسلام تمدنی اور سیاسی قومیت کی عمارت اٹھاتا ہے۔ ایک ماں کے دو بیٹے نسلاً ایک قومیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک محلہ کے دو باشندے وطنی حیثیت سے ایک قومیت کے افراد ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہے تو ان کی تہذیبی قومیتیں الگ الگ ہو جائیں گی اور اصولی حیثیت سے وہ اختلاف رونما ہوگا جس پر بحث کر رہے ہیں۔

صرف یہ ہیں کہ جب تک ہماری اور اُن کی قومیت الگ ہے اور ہمارے اور ان کے اصول ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ہم میں اور ان میں حقیقی و دائمی صلح اور دوستی نہیں ہو سکتی۔ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔[1]

(الممتحنہ: ۴)

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر حدیث میں بتمام و کمال بیان فرما دیا ہے:-

أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَأَنْ يَّسْتَقْبِلُوْا قِبْلَتَنَا وَأَنْ يَّأْكُلُوْا ذَبِيْحَتَنَا وَأَنْ يُّصَلُّوْا صَلٰوتَنَا فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ حَرُمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ۔

(ابوداؤد باب علی ما یقاتل المشرکین)

مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ہمارے اوپر ان کے خون اور ان کے اموال حرام ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی حق کے بدلے میں ان کو لیا جائے۔ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں

---

[1] حضرت ابراہیمؑ نے کفار سے کہا کہ ہم تم سے اور ان معبودوں سے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے ہو، بے تعلق ہیں۔ ہم تم سے الگ ہو گئے اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور دشمنی ہو گئی۔ تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

اور ان پر فرائض وہی عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس اعتقادی قانون کی رُو سے اسلام اور کفر کے درمیان ابدی جنگ ہے، مگر یہ جنگ محض نظری (Theoretical) ہے۔ ہر کافر حربی (Enemy) ہے، مگر اس معنی میں کہ جب تک ہماری اور اس کی قومیت الگ ہے ہمارے اور اس کے درمیان بنائے نزاع قائم ہے۔ ہر دار الکفر محلِ حرب ہے۔ یا بالفاظِ دیگر حربیت کا کلی ارتفاع صرف اختلافِ قومیت ہی کے مٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔ اس قانون نے محض ایک نظریہ اور قاعدۂ اصلیہ واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے جس پر ان کی حکمتِ عملی کی بنا قائم ہے۔ باقی رہے حقوق وواجبات اور جنگ وصلح کے عملی مسائل تو ان کا اس قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دستوری اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔

دستوری قانون

دستوری قانون کی رُو سے اسلام دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک دار الاسلام۔ دوسرے دار الکفر۔ دار الاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کر سکیں[1]۔ اس کے مقابلہ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی

---

[1] دار الاسلام کی یہ تعریف تھوڑی سی تشریح کی محتاج ہے۔ درحقیقت صحیح معنوں میں دار الاسلام صرف وہ علاقہ ہے جہاں اسلام بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے حکمران ہو اور جہاں اسلامی قانون ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔ لیکن اگر کبھی ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ کسی ملک میں اقتدارِ حکومت ہو تو مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں مگر وہ اسلام کے بجائے کوئی اور نظامِ زندگی قائم کر دیں اور اسلامی قانون کے بجائے کوئی اور قانون نافذ کرنے لگیں، تو فقہائے اسلام ان سے مایوس ہو کر دفعتہً اس ملک کے "دار الکفر" ہونے کا اعلان کر دینا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے بالقوۃ "دار الاسلام" ہی قرار دیئے چلے جاتے ہیں (باقی حاشیہ ص ۳۰۰ پر)

قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تمام وہ ممالک جن میں انگریزی حکومت ہے انگریزی علاقہ کہلائیں گے، اور جو علاقے ان حدود سے باہر

(بقیہ حاشیہ ۲۹۹ سے) جب تک کہ وہ مسلمان خود اسلام سے اپنا برائے نام تعلق بھی منقطع نہ کر لیں۔ فقہاء کا یہ محتاط طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی کسی با اختیار حکومت کا اپنے اصول اور قوانین میں نامسلمان ہونا لامحالہ دو ہی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ پر مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ملک کے مسلمان باشندے تو بدستور اسلام ہی کے معتقد ہوں اور اسی کی پیروی میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں مگر کسی نہ کسی سبب سے ایک گمراہ طبقہ زمام کار پر قابض ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ملک کے باشندوں میں عام طور پر جہالت اور گمراہی پھیل گئی ہو اور ان کی اپنی پسند سے وہ ضال اور مضل طبقہ برسر اقتدار آیا ہو جو غیر اسلامی طریقوں پر قومی معاملات چلا رہا ہو۔ پہلی صورت میں تو یہ عین متوقع ہے کہ عامۂ مسلمین کا اسلامی شعور آخر کار بیدار ہو گا اور وہ اُس گروہ کے اقتدار کو اُلٹ پھینکیں گے جو اسلام کے گھر میں کفر کا کاروبار چلا رہا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس عارضی غلبۂ کفر کو دیکھ کر مایوس ہو جائیں اور جلد بازی سے کام لے کر اس گھر کو خود ہی کفر کا گھر قرار دے بیٹھیں۔ رہی دوسری صورت تو وہ بلاشبہ مایوسی کا مقام ہے، لیکن جس قوم نے جہالت اور گمراہی کے باوجود ابھی تک اسلام سے اپنا تعلق نہیں توڑا ہے اور جو اس قدر بگڑ جانے پر بھی اپنا مذہب ابھی تک اسلام ہی بتائے جا رہی ہے، اس کی طرف سے ہم بھی اتنے مایوس نہیں ہو سکتے کہ اصلی اور حقیقی اسلام کی طرف اس کی واپسی کی ساری امیدیں منقطع کر لیں۔ لہٰذا ہم اس کے گھر کو بھی دارالکفر نہیں کہیں گے بلکہ دارالاسلام ہی کہتے رہیں گے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عملاً اسلامی قانون کا تعلق صرف دارالاسلام سے ہے جو بالفعل دارالاسلام ہو۔ رہا وہ رعایتی "دارالاسلام" جس نے خود ہی اسلام سے اپنا قانونی تعلق توڑ رکھا ہو تو اسلام اس کے سیاسی نظام کو وہ دستوری حقوق دینے کے لیے تیار نہیں ہے جو اس نے صرف "اسلامی حکومت" کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔

ہوں گے ان کو علاقۂ غیر کہا جائے گا۔ اسلامی حکومت اسلام کے احکام کو صرف اُن لوگوں پر نافذ کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ عمل (Jurisdicion) میں رہتے ہوں۔ اسی طرح وہ صرف اُنہی اموال اور اعراض اور نفوس کی حفاظت کر سکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ اختیار یا علاقۂ مقبوضہ (Territory) میں واقع ہوں۔ ان حدود کے باہر کسی چیز کی حفاظت کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے ہر وہ جان اور مال اور عزت "معصوم" (Protected) ہے جو دارالاسلام میں اسلامی حکومت کی حفاظت کے اندر واقع ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ اور ہر وہ جان اور مال اور عزت "غیر معصوم" (ر) ہے جو دارالکفر میں ہو اور جس کی محافظ اسلامی حکومت نہ ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی غیر معصوم ہونے کا مآل صرف اس قدر ہے کہ اگر اس کی جان و مال یا عزت پر کسی کا حملہ کیا جائے تو اسلامی حکومت اس پر کوئی مؤاخذہ کرے گی، کیونکہ یہ فعل اس کے حدودِ عمل سے باہر واقع ہُوا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خدا کے نزدیک وہ فعل گناہ ہو یا نہ ہو اور خدا کے ہاں اس پر مواخذہ ہو یا نہ ہو۔ پس کسی چیز کا غیر معصوم ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ مباح بھی ہے، نہ اس کی عدمِ عصمت کو اس معنی میں لیا جا سکتا ہے کہ اُسے نقصان پہنچانا یا اس پر قبضہ کر لینا عنداللہ بھی جائز اور حلال ہے۔ اسی طرح دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے اگر کسی ایسے فعل کو جائز ٹھہرایا جائے جس کا ارتکاب دارالکفر میں کیا گیا ہو تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہو گا کہ اسلامی اسلامی حکومت کو اس سے کوئی تعرض نہیں، وہ اس پر کوئی سزا نہیں دے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس فعلِ حرام پر خدا کے ہاں بھی کوئی گرفت نہ ہو گی۔

یہاں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کے حدود الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اعتقادی قانون جس مسلمان کو بھائی کہتا ہے اور جس کی جان و مال کو حرام ٹھہراتا ہے وہ دستوری قانون کی نگاہ میں غیر معصوم ہے، اس لیے کہ وہ سلطنت اسلامی کے

حدودِ اختیار سے باہر رہتا ہے۔ اور جس کافر کو اعتقادی قانون دشمن قرار دیتا ہے دستوری قانون اسے معصوم ٹھہراتا ہے صرف اس بنا پر کہ وہ اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آ گیا ہے۔ جس فعل کو اعتقادی قانون سخت گناہ اور جرم ٹھہراتا ہے، دستوری قانون اس پر کوئی گرفت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے حدودِ عمل سے باہر ہوا ہے۔ دونوں میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ اعتقادی قانون کا تعلق آخرت سے ہے اور دستوری قانون کا تعلق صرف دنیا اور اس کے معاملات سے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے سوا تمام فقہا نے کم و بیش ان دونوں میں خلط ملط کیا ہے اور وہ ان کے حدود میں پوری طرح تمیز نہیں کر سکے ہیں۔

چند مثالوں سے ہم اس پیچیدہ مسئلہ کی توضیح کریں گے۔

(۱) فرض کیجیے کہ ایک مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں جاتا ہے اور وہاں سے کچھ مال چُرا لاتا ہے۔ یہ فعل اعتقادی قانون اور بین الاقوامی قانون کی رُو سے حرام ہے کیونکہ اس شخص نے عہد شکنی کی ہے۔ لیکن دستوری قانون اس شخص کو اس مال کا جائز مالک قرار دیتا ہے اور اس سے کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔

(ہدایہ باب المستامن)

(۲) فرض کیجیے کہ دار الاسلام کی رعایا کا ایک شخص دار الحرب میں قید تھا۔ وہ وہاں قید سے چھوٹ گیا یا چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ وہاں خواہ چوری کرے، شراب پیئے، زنا کرے، سب کچھ دستوری قانون کی رو سے ناقابلِ مواخذہ ہے (بحر الرائق ج ۵ ص ۱۰۷) یعنی اسلامی حکومت اس پر نہ اس کا ہاتھ کاٹے گی، نہ حدِ زنا و شراب جاری کرے گی نہ قصاص لے گی۔ مگر اعتقادی قانون کی رُو سے وہ خدا کے ہاں گناہگار ہو گا۔

(۳) فرض کیجیے کہ ایک شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا اور وہاں سے ہجرت کر کے

لہ واضح رہے کہ بیرونی ممالک میں جا کر دار الاسلام کی رعایا کے جو لوگ جرائم (باقی صفحہ ۳۰۳ پر)

دارالاسلام میں نہیں آیا۔ اعتقادی قانون کی رُو سے وہ مسلمان کا بھائی ہو چکا ہے۔ اس کا خون اور مال حرام ہو چکا ہے۔ مگر دستوری قانون کی رُو سے وہ چونکہ اسلامی سلطنت کے حدودِ عمل سے باہر ہے اس لیے اس کی کوئی چیز معصوم نہیں۔ اس کی حیثیت وہی ہو گی جو دشمن سلطنت کی رعایا کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان دارالاسلام کے حدود سے باہر اس کو قتل کر دے تو اسلامی عدالت نہ اس پر قصاص لے گی نہ خوں بہا دلوائے گی ــــ بطور خود وہ کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اس سے سُود لے یا اس کے مال پر کسی دوسرے ناجائز طریقہ سے قبضہ کر لے تو دستوری قانون کی رُو سے یہ نا قابلِ گرفت ہے کیونکہ اس کا مال غیر معصوم ہے۔ اس باب میں فقہا کی تصریحات نہایت معنی خیز ہیں:۔

وَاِذَا اَسْلَمَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْحَرْبِ فَقَتَلَهٗ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَبْلَ اَنْ يَخْرُجَ اِلٰى دَارِالْاِسْلَامِ خَطَاءً فَعَلَيْهِ الْكَفَّارَةُ وَلَا دِيَةَ عَلَيْهِ وَفِى الْاِمْلَاءِ عَنْ اَبِىْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ لَاَنَّهٗ لَا كَفَّارَةَ عَلَيْهِ اَيْضًا لِاَنَّ وُجُوْبَهَا بِاعْتِبَارِ تَقَوُّمِ الدَّمِ لَا بِاعْتِبَارِ حُرْمَةِ الْقَتْلِ ....

وتقوم الدم يكون بالاحراز بدار الاسلام۔

(شرح السیر الکبیر مطبوعہ دائرۃ المعارف ج ۱۔ ص ۸۸)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۲ سے) اور بد اخلاقیوں کا ارتکاب کریں ان سے دارالاسلام کی حکومت اس بات پر تو ضرور باز پرس کر سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے رویہ سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا سامان کیا، اور اس بنیاد پر بھی وہ ان سے مواخذہ کر سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے غلط طرزِ عمل سے اپنی ریاست کے لیے بین الاقوامی معاملات میں اُلجھنیں پیدا کیں۔ لیکن اُن پر نفسِ اُس جرم (مثلاً قتل یا چوری) کے بارے میں کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا جس کا ارتکاب انہوں نے دارالاسلام کے حدود سے باہر کیا ہو۔

اگر اہل حرب میں سے کوئی شخص مسلمان ہو چکا ہو اور قبل اس کے کہ وہ ہجرت کرکے دارالاسلام میں آئے، کسی مسلمان نے اسے بلا ارادہ قتل کر دیا تو اس پر کفارہ ہے مگر خوں بہا واجب نہیں۔ اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے املا میں یہ مسئلہ منقول ہے کہ اس پر کفارہ بھی نہیں ہے کیونکہ کفارہ کا وجوب خون کے باقیمت ہوجانے کے اعتبار سے ہے نہ کہ حرمتِ قتل کے اعتبار سے .... اور خون صرف اس وقت باقیمت ہوتا ہے جب کہ وہ دارالاسلام کی حفاظت میں آچکا ہو۔

وَلَمَّا ثَبَتَ بِمَا قَدَّمْنَا اَنَّهٗ لَا قِيْمَةَ لِدَمِ الْمُقِيْمِ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ بَعْدَ اِسْلَامِهٖ قَبْلَ الْهِجْرَةِ اِلَيْنَا ..... اَجْرَوْهُ اَصْحَابُنَا مَجْرَى الْحَرْبِیِّ فِیْ اِسْقَاطِ الضَّمَانِ عَنْ مُتْلِفِ مَالِهٖ ...... وَاَنْ يَكُوْنَ مَالُهٗ كَمَالِ الْحَرْبِیِّ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَلِذٰلِكَ اَجَازَ اَبُوْحَنِيْفَةَ مُبَايَعَتَهُ الْحَرْبِیَّ مِنْ بَيْعِ الدِّرْهَمِ بِالدِّرْهَمَيْنِ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ۔

(احکام القرآن الحنفی، ج ۲- ص ۲۹۷)

اور جب ہماری پچھلی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہجرت نہ کرے اور دارالحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں[1]۔

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان کسی اسلامی حکومت کی حفاظت میں نہیں ہے بلکہ اس کے حدود اختیار سے باہر رہتا ہے اس کا خون بجائے خود خواہ کتنی ہی بڑی قیمت رکھتا ہو، لیکن اسلامی حکومت کے لیے اس کی قانونی قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے کوئی گزند پہنچے تو اسلامی حکومت اس کی کوئی دادرسی نہیں کر سکتی۔ اسے کوئی قتل کر دے تو اسلامی حکومت پر اس کا قصاص یا خوں بہا دلوانے کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے مال یا آبرو سے کوئی بے جا (باقی حاشیہ ص ۳۰۵ پر)

...... تو اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ایسے مسلمان کی حیثیت حربی ہی کی قرار دی ہے یعنی اس کے مال کو تلف کرنے والے پر کوئی ضمان نہیں ...... اس حیثیت سے اس کا مال گویا حربی کا مال ہے اور اس بنا پر ابو حنیفہ نے اس کے ساتھ بھی اسی طرح خرید و فروخت کرنا جائز ٹھہرایا ہے جس طرح حربی کے ساتھ جائز ہے۔ یعنی دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا۔

وقال الحسن بن صالح اذا اسلم الحربی فاقام ببلادھم وھو یقدر علی الخروج فلیس بمسلم یحکم علی اہل الحرب فی مالہ ونفسہ۔ (احکام القرآن)

حسن بن صالح کا قول ہے کہ جب دار الحرب کا ایک باشندہ مسلمان ہونے کے بعد دار الحرب ہی میں رہا۔ درآنحالیکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا تھا تو اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں[1]۔ اس کی جان و مال کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۴ سے) تعرض کرے تو اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ اس ظلم کا تدارک کرے۔ مگر یہ سب کچھ قانونی حیثیت سے ہے۔ ورنہ اعتقادی طور پر تو مسلمان کی جان مال اور آبرو مسلمانوں کے لیے دنیا جہان سے زیادہ قیمتی ہے اور دار الاسلام کے مسلمانوں کی دینی حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دار الکفر کے مسلمانوں کی جتنی اخلاقی مدد کر سکتے ہیں۔

[1] موجودہ زمانہ میں اس حکم کے لیے "ہجرت کی قدرت رکھنے" کے ساتھ ایک شرط اور بھی لگانی ہوگی، اور وہ یہ کہ دار الاسلام نے مہاجرین کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے ہوں اور اسلامی حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا ہو کہ مطلقاً دار الحرب اور دار الکفر کے، یا کسی خاص دار الحرب اور دار الکفر کے مسلمان اس کی طرف سمٹ آئیں۔ اس صورت میں جو لوگ قدرت کے باوجود ہجرت نہ کریں گے ان کے ساتھ دار الاسلام کے مسلمان ہر حیثیت سے وہی معاملہ کریں گے جو اس دار الکفر یا دار الحرب کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ہوگا۔ (باقی صفحہ ۶ پر)

وہی حکم ہے جو اہلِ حرب   کی جان و مال کا ہے

وَ اِذَا اَسْلَمَ الْحَرْبِیُّ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ فَقَتَلَهٗ مُسْلِمٌ عَمَدًا اَوْ خَطَأً وَلَهٗ وَرَثَةٌ مُسْلِمُوْنَ هُنَاكَ فَلَا شَیْءَ عَلَیْهِ اِلَّا الْكَفَّارَةُ فِی الْخَطَاءِ۔   (ہدایہ کتاب السیر)

جب کوئی حربی دارالحرب میں مسلمان ہو چکا ہو اور کوئی مسلمان اسے عمداً یا خطأً قتل کر دے اور اس کے مسلمان ورثا بھی دارالحرب میں موجود ہوں تو اس پر کوئی قصاص یا دیت نہیں ہے۔ خطا کی صورت میں محض کفارہ ادا کر دے۔

وَحُكْمُ مَنْ اَسْلَمَ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ وَلَمْ يُهَاجِرْ كَالْحَرْبِیِّ عِنْدَ اَبِیْ حَنِيْفَةَ لِاَنَّ مَالَهٗ غَيْرُ مَعْصُوْمٍ عِنْدَهٗ۔

(بحر الرائق ج ۵ - ص ۱۴۷)

اور جو شخص دارالحرب میں مسلمان ہو اور ہجرت نہ کرے اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵ سے) اور جو لوگ صریح طور پر ہجرت سے معذور رہوں گے اگرچہ دستوری حیثیت سے ان کے حقوق کچھ بھی نہیں ہیں، تاہم ان کے ساتھ بالکل غیر مسلم کا سا معاملہ نہیں کیا جائے گا بلکہ فوج کے سپاہیوں اور دوسرے مسلمانوں کو ہدایات دے دی جائیں گی کہ جنگ میں ان کو بچانے کی جس حد تک کوشش ممکن ہو کریں، اور حالتِ صلح میں بھی ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نرمی و رعایت کا برتاؤ کرتے رہیں۔ لیکن جب کہ دارالاسلام کی حکومت کی طرف سے باہر کے مسلمانوں کے لیے نہ تو ہجرت کی دعوت ہو اور نہ اس نے ان کی آمد کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھا ہو، تو اس صورتِ حال میں بیرونی مسلمانوں پر حسن بن صالح کا یہ قول چسپاں نہیں ہوتا کہ ان میں سے جو ہجرت کی قدرت رکھتا ہو اور ہجرت نہ کرے "اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں ہے" البتہ دستوری قانون کا یہ اصول بہرحال اپنی جگہ اٹل ہے کہ جو مسلمان دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں اور اس کے حدودِ اقتدار سے باہر ہوں ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ذمہ داری دارالاسلام کی حکومت پر نہیں ہے۔

حیثیت ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک حربی کی ہے کیوں کہ اس کا مال ان کی رائے میں غیر معصوم ہے۔

(۴) فرض کرو کہ ایک مسلمان امان لے کر دار الحرب میں گیا اور وہاں اس نے کسی حربی سے قرض لیا یا اس کا مال غصب کر لیا۔ پھر وہ دار الاسلام واپس آ گیا اور وہ حربی بھی دار الاسلام میں امان لے کر آیا۔ یہاں وہ حربی مستامن اس قرض یا اس مال مغصوبہ کے لیے دار الاسلام کی عدالت میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلامی عدالت اس کو ایک پیسہ واپس نہ دلائے گی۔ اسی طرح اگر دار الحرب میں میں حربی نے مسلمان کا قرض مار لیا ہو اس کا مال غصب کر لیا ہو، پھر وہ حربی امان لے کر دار الاسلام میں آ جائے تب بھی اسلامی عدالت اس حربی کے خلاف اس مسلمان کی کوئی دادرسی نہ کرے گی۔ (الجامع الصغیر لامام محمدؒ علی ہامش کتاب الخراج الامام ابی یوسف ص ۷۵)

(۵) اگر باپ دار الاسلام میں ہو اور اس کی نابالغ اولاد دار الحرب میں ہو تو اس اولاد پر سے باپ کی ولایت ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر مال کا مالک دار الاسلام میں ہو اور مال دار الحرب میں ہو تو مالک کی جان معصوم ہو گی مگر مال معصوم نہ ہو گا۔ (فتح القدیر ج ۴۔ ص ۳۵۵۔)

(۶) دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان امان لے کر دار الحرب میں چلے گئے اور وہاں ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ اگر قاتل دار الاسلام میں واپس آئے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔

(وانَّمَا لَایَجِبُ الْقِصَاصُ لِاَنَّہٗ لَا یُمْکِنُ اِسْتِیْفَاؤُہٗ اِلَّا مَنَعَۃ ولامنعہ دونَ الْاِمَامِ وَجَمَاعَۃُ المسلمین وَلَمْ یُوْجَدُ ذَالِکَ فِیْ دَارِالْحَرْبِ۔ (ھدایہ۔ کتاب السیر)

اس پر قصاص اس لیے واجب نہیں کہ قصاص بغیر حفاظت (Protection) کے واجب نہیں آتا اور حفاظت بغیر امام اور جماعت

مسلمین کے نہیں ہوتی۔ اور یہ چیز دارالحرب میں موجود نہیں ہے۔

(۷) دارالاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان دارالحرب میں قید تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ یا کوئی مسلمان امان لے کر دارالحرب گیا اور وہاں اس نے کسی مسلمان اسیر کو قتل کر دیا۔ دونوں صورتوں میں قاتل پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا۔ علامہ ابن ہمام نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ اور بھی زیادہ معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں:-

فَلَا شَیْئَ علی القَاتِلِ مِنْ اَحْکَامِ الدُّنْیَا اِلَّا الکَفَّارَۃَ فِی الْخَطَاءِ عِنْدَ اَبِی حَنِیْفَۃَ وَانما عَلَیْہِ عِقَابُ الاٰخِرَۃِ فِی العَمدِ..... لِاَنَّہٗ صَارَ بِالاَسرِ تَبعًا لھم...... وصَارَ کالمسلم الّذِی لَمْ یُھَاجِرْ اِلینا فِی سقوطِ عصمتہ الدنیویۃ۔

(فتح القدیر ج ۴ ص ۲۵۱)

ابو حنیفہ کے نزدیک قاتل پر احکام دنیا میں سے کچھ نہیں بجز اس کے کہ وہ خطا کی صورت میں کفارہ ادا کر دے۔ رہا قتل عمد تو اس پر کفارہ بھی نہیں، البتہ آخرت کا عذاب ہے۔۔۔۔ قصاص اور دیت کے ساقط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قید ہونے کی وجہ سے وہ اہل حرب کا تابع ہو گیا۔۔۔۔ اور اس کی حیثیت اس مسلمان کی سی ہو گئی جس نے ہماری طرف ہجرت نہ کی ہو، اور اس حیثیت سے اس کی دنیوی عصمت ساقط ہو گئی۔

دیکھیے ان مثالوں میں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کا فرق کس قدر نمایاں ہے۔ اعتقادی قانون مسلمانوں کو ایک قوم اور کفار کو دوسری قوم قرار دیتا ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی جان، مال اور عزت کو کافر کی جان و مال اور عزت پر ترجیح دی جائے۔ لیکن دستوری قانون اس عالمگیر تقسیم کے بجائے اپنے حدود عمل (جورسڈکشن) کو حدود ارضی (Territorial Limits) تک محدود کرتا ہے سلطنت اسلامیہ کے حدود میں جو جان ہے، جو مال ہے، جو شے ہے وہ "معصوم" ہے،

خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی، کیونکہ سلطنت کا قانون اس کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے۔ اور ان حدود کے باہر جو چیز ہے " غیر معصوم " ہے، خواہ وہ مسلم کی ہو یا کافر کی۔ اسلامی حدود کے اندر کوئی چوری کرے گا تو ہم ہاتھ کاٹیں گے، قتل کرے گا تو ہم قصاص یا دیت وصول کریں گے، ناجائز ذرائع سے مال لے گا تو واپس دلائیں گے۔ اور ان حدود کے باہر کوئی مسلمان یا ذمی ایسا فعل کرے جو ہمارے قانون کی رُو سے جرم ہو تو ہم نہ علاقہ غیر میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں نہ اپنے علاقہ میں واپس آنے کے بعد، اس لیے کہ فعل ان حدود میں ہُوا ہے جہاں قیامِ امن اور حفاظتِ جان و مال کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے دنیوی حیثیت سے ہے۔ حدودِ اسلامی سے باہر جو گناہ کیا جائے گا وہ دنیوی حکومت کے حدودِ عمل سے باہر ہونے کے باعث صرف دنیوی مواخذہ سے چھوٹ جائے گا۔ البتہ اللہ کے مواخذہ سے نہ چھوٹے گا، کیونکہ اللہ کی عملداری حدودِ ارضی سے ناآشنا (Ultra territorial) ہے، اس نے جو کچھ حرام ٹھہرایا ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قانون نہیں ہے بلکہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے۔ وہی قرآن جو ایک طرف فَإِنْ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ اور وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا کہتا ہے، دوسری طرف وہی قرآن حدودِ اسلامی کے اندر رہنے والے مسلمان اور علاقہ غیر میں رہنے والے مسلمان کے خون میں فرق بھی کرتا ہے۔ اوّل الذکر کو دانستہ قتل کرنے والے پر کفارہ بھی ہے اور دیت بھی ——— اور موخّر الذکر کے قاتل پر صرف کفارہ[1] ہے۔

---

[1] وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق" سے یہ مراد ہے کہ اگر علاقہ غیر میں رہنے والا مسلمان کسی ایسی قوم سے ہو جس سے خون بہا کے باب میں مسلمان کا معاہدہ ہو چکا ہو تو جس طرح اس قوم کے ایک غیر مسلم فرد کا خون بہا دیا جائے گا اسی طرح اس کے ایک مسلمان فرد کا بھی دیا جائیگا۔ پس یہ خون بہا معاہدہ کی بنا پر ہے نہ کہ عصمتِ اسلامی کی بناء پر (ملاحظہ ہو سورۂ نساء رکوع ۱۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسامہ بن زید کو ایک سریہ کا افسر بنا کر حرقات کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہاں ایک شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ کر جان بچانا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو اُسامہ کو بلا کر آپ بار بار فرماتے ہیں "من لك بلا الٰہ الا اللہ یوم القیمۃ۔" قیامت کے روز تجھے لا الٰہ الا اللہ کے مقابلہ میں کون بچائے گا؟ مگر اس مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم نہیں دیتے[1]۔ ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر حدودِ اسلامی سے باہر رہنے والے چند مسلمان مارے جاتے ہیں تو حضورؐ فرماتے ہیں "انا بریءٌ من کل مسلم یقیم بین اظھر المشرکین"۔ میں ہر ایسے مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو[2]" خود قرآن میں بھی ایسے مسلمان کی ذمہ داری سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا۔ (الانفال - ۷۲)

اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہ آگئے ان سے تمہارا "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں[3]۔

---

[1] ابو داؤد، باب علی ما یقاتل المشرکین۔

[2] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب مذکور۔ اس دوسرے واقعہ میں حضورؐ نے مقتولوں کی نصف دیت دلوائی تھی۔ اغلب ہے کہ آپ کا یہ فعل اُس آیت کے نزول سے پہلے کا ہوگا جس میں ایسے مقتول کی دیت ساقط کی گئی ہے۔

[3] یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی نہایت اہم دفعات میں سے ہے۔ اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ "ولایت" کے تعلقات صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہوں گے جو دارالاسلام کے باشندے ہوں یا باہر سے دارالاسلام میں ہجرت کر کے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۱ پر)

اس طرح قرآن اور حدیث نے خود ہی دنیوی عصمت کو دینی عصمت سے الگ کر دیا ہے اور دونوں کے حدود بتا دیئے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام میں صرف امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ہی ایسے فقیہ ہیں جنہوں نے اس نازک اور پیچیدہ قانونی مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے۔ امام ابو یوسف، امام محمدؒ امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر مجتہدین بھی ان دونوں قسم کی عصمتوں میں پوری پوری تمیز نہیں کر سکے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر دارالکفر میں اسلامی رعایا کا ایک فرد دوسرے کو قتل کر دے تو یہ سب حضرات بالاتفاق فرماتے ہیں کہ قاتل سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک شخص کو قتل کیا جو "معصوم بالاسلام" تھا۔[1] پس جب اتنے بڑے بڑے آئمہ اس مسئلہ میں مختلط ہو گئے ہیں تو کچھ

(بقیہ صفحہ ۳۱۰ سے) آجائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو دارالاسلام سے باہر رہتے ہوں، یا دارالاسلام میں آئیں بھی تو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے آئیں، تو ان کے اور اہل دارالاسلام کے درمیان "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ "ولایت" کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات پر بولا جاتا ہے اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے اور خود شہریوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ پس یہ آیت دارالاسلام سے باہر کے مسلمانوں کو دینی اخوت کے باوجود اس سیاسی و تمدنی رشتے سے خارج کر دیتی ہے، اور اس سے وسیع قانونی نتائج نکلتے ہیں جن کی تفصیلات فقہ کی مبسوط کتابوں میں موجود ہیں۔ مثلاً اسی "عدم ولایت" کا نتیجہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمان آپس میں شادی بیاہ نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے۔ اسلامی حکومت کسی ذمہ داری کے منصب پر کسی ایسے مسلمان کو مامور نہیں کر سکتی جس نے رعیت ہونے کا تعلق دارالکفر سے نہ توڑا ہو۔

[1] ملاحظہ ہو الجامع الصغیر اور فتاوی قاضی خاں۔

بعید نہیں کہ فقہ حنفی کے متاخر شارحین کو بھی امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی بات سمجھنے میں یہی غلط پیش آیا ہو۔

دارالحرب اور دارالکفر کا اصطلاحی فرق

امام اعظم کے متعلق ہم کو تحقیق ہے کہ اوپر جتنے مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں اور اسی قبیل کے دوسرے مسائل میں انہوں نے دارالحرب کے بجائے "دارالکفر" کی اصطلاح استعمال کی تھی، کیونکہ دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دارالاسلام کا مقابل دارالکفر بمعنی علاقۂ غیر (Foreign territory) ہی ہو سکتا ہے، حرب اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں جو ممالک اسلامی سلطنت سے صلح رکھتے ہوں وہ بھی دارالکفر ہیں۔ اور ان سے بھی وہ سب احکام متعلق ہیں جو اُوپر بیان ہوئے۔ لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دارالکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے وہ عموماً دارالحرب ہی میں رہتے تھے، اس لیے بعد کے فقہاء نے دارالکفر کو بالکل دارالحرب کا ہم معنی سمجھ لیا اور ان دونوں اصطلاحوں کے باریک قانونی فرق کو نظر انداز کر گئے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رح کے کلام میں ہم کو کسی جگہ کوئی ایسا لفظ نہیں ملا جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ "غیر معصوم" کو "مباح" کے معنی میں لیتے ہیں۔ وہ حدود اسلام سے باہر کی اشیاء کو "غیر معصوم" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور ایسی اشیاء پر دست درازی کرنے والے کے لیے صرف اتنا کہتے ہیں لاشئ علیہ۔ یالم یقض علیہ وغیرہ۔ یعنی اس پر کوئی گرفت نہیں، یا اس کے خلاف کوئی عدالتی فیصلہ صادر نہ کیا جائے گا۔ لیکن بعد کے فقہاء نے اکثر مقامات پر "عدم عصمت" اور "اباحت" کو خلط ملط کر دیا جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ حدودِ اسلامی سے باہر جتنے ممنوع افعال کیے جائیں ان پر جس طرح حکومت اسلامی باز پُرس نہیں کرے گی اسی طرح خدا بھی باز پرس نہیں کرے گا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ آپ ہندوستان میں کسی کا مال چُرا لیجیے۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کی عدالت میں آپ پر مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔ دارالاسلام کے

قانون کی رُو سے آپ بری الذمہ ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی کب ہیں کہ خدا کی عدالت سے بھی آپ چھوٹ گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کے اندر سود اور قمار اور دوسرے عقود فاسدہ کی اباحت کا جو مسئلہ اس بنا پر لکھا گیا ہے کہ حربی کے لیے کوئی "عصمت" (Protection) نہیں تو اس کے دو پہلو ہیں:۔

ایک یہ کہ دارالحرب سے مراد محض "علاقہ غیر" ہو۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ دستوری قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ "حربی" (بمعنی رعیتِ غیر) کے مال کی حفاظت کا ذمہ چونکہ ہم نے نہیں لیا ہے اس لیے ہمارے حدودِ عمل سے باہر ہماری سلطنت کا کوئی شہری اگر اس سے سُود لے کر یا جوا کھیل کر یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لے کر ہمارے علاقہ میں آ جائے تو ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہ کریں گے، قطع نظر اس سے کہ دین و اعتقاد کے نقطۂ نظر سے وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

دُوسرا پہلو یہ ہے کہ دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو یعنی (Enemy Country) اس لحاظ سے یہ مسئلہ تعلقاتِ خارجیہ کے قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کو ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

تعلقات خارجیہ کا قانون

اسلامی قانون کا یہ شعبہ اُن لوگوں کے جان و مال کی قانونی حیثیات سے بحث کرتا ہے جو اسلامی حکومت کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے چند امور کی توضیح ضروری ہے۔

فقہی اصطلاح میں لفظ "دار" قریب قریب انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں انگریزی لفظ (Territory) بولا جاتا ہے۔ جن حدودِ ارضی میں مسلمانوں کو حقوقِ شاہی حاصل ہوں وہ "دارالاسلام" ہیں، اور جو علاقہ ان حدود سے خارج ہو وہ "دار الکفر یا دارالحرب" ہے۔ تعلقاتِ خارجیہ کا قانون تمام تر انہی مسائل سے بحث کرتا ہے جو اس ارضی تفریق یا اختلافِ دارین سے نفوس اور اموال کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اعتقادی حیثیت سے تو تمام مسلمان اسلامی قومیت کے افراد (National) ہیں۔ لیکن اس شعبۂ قانون کی اغراض کے لیے ان کو تین اقسام پر منقسم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو دارالاسلام کی رعایا (Citizens) ہوں۔ دوسرے وہ جو دارالکفر یا دارالحرب کی رعایا ہوں، تیسرے وہ جو رعایا تو دارالاسلام ہی کی ہوں مگر مستامن کی حیثیت سے عارضی طور پر دارالکفر یا دارالحرب میں جائیں اور مقیم ہوں۔ ان سب کے حقوق اور واجبات الگ الگ متعین کیے گئے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں کفار اگرچہ سب کے سب اعتقاداً اسلامی قومیت سے خارج ہیں، مگر قانوناً ان کو بھی ان کے حالات کے لحاظ سے متعدد اقسام پر منقسم کیا گیا ہے ایک وہ جو پیدائشی ذمّی (Natural Born subjects) ہوں یا وضع جزیہ و خراج کے ذریعہ سے جن کو ذمّی بنا لیا گیا ہو (Naturalised subjects) دوسرے وہ جو دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں، بلکہ مستامن کی حیثیت دارالاسلام میں آئیں اور رہیں (Domiciled Aliens) تیسرے وہ جو دارالکفر یا دارالحرب کی رعایا ہوں اور امان کے بغیر دارالاسلام میں داخل ہو جائیں۔ چوتھے وہ جو اپنے ہی دار میں ہوں۔ پھر اس آخری قسم کے کفار کی بھی متعدد اقسام ہیں ایک وہ جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ نہ ہو مگر دشمنی بھی نہ ہو۔ دوسرے وہ جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہیں مگر ان کی حدود میں احکام اسلامی جاری نہ ہوں تیسرے وہ جن سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر دشمنی بھی نہ ہو چوتھے وہ جن سے مسلمانوں کی دشمنی ہو۔

اس طرح حدود ارضی یعنی دار (Territory) کے لحاظ سے اشخاص اور املاک کی حیثیات میں جو فرق ہوتا ہے اور اس فرق کے لحاظ سے ان کے درمیان احکام میں جو تمیز کی جاتی ہے اس کو مدِّ نظر رکھنا قانونِ اسلامی کی صحیح تعبیر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب کبھی ان فروق اور امتیازات کا لحاظ کیے بغیر محض قانونی عبارات کے الفاظ کی پیروی کی جائے گی تو صرف ایک سُود کے مسئلہ ہی میں نہیں بلکہ بکثرت

فقہی مسائل میں ایسی غلطیاں پیش آئیں گی جن سے قانون مسخ ہو جائے گا اور اپنے مقاصد کے خلاف استعمال کیا جانے لگے گا۔

ان ضروری توضیحات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ دارالحرب کا اطلاق دراصل کن علاقوں پر ہوتا ہے، کن مراتب کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے احکام کیا ہیں، حربیت کے کتنے مدارج ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اباحت نفوس و اموال کی نوعیت کس طرح بدلتی ہے۔ پھر اختلاف دارین کے لحاظ سے خود مسلمان کی حیثیات میں کیا فرق ہوتا ہے اور ہر حیثیت سے ان کے حقوق و واجبات کس طرح بدلتے ہیں۔

کفّار کی اقسام

کفار کی جو اقسام ہم نے اُوپر بیان کی ہیں ان میں سے اہل ذمّہ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ بجز خمر و خنزیر اور نکاح محارم اور عبادت غیر اللہ کے اور تمام معاملات میں ان کی حیثیت وہی ہے جو مسلمانوں کی ہے۔ اسلام کے ملکی قوانین ان پر جاری ہوتے ہیں، وہ ان سب چیزوں سے روکے جاتے ہیں جن سے مسلمان روکے جاتے ہیں، اور ان کو عصمت جان و مال و آبرو کے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں مستامن کافروں کا معاملہ بھی ذمیوں سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ ان پر بھی اسلامی حکومت کے احکام نافذ ہوتے ہیں اور دارالاسلام ہونے کی وجہ سے ان کو بھی عصمتِ جان و مال حاصل ہوتی ہے۔ ان کو الگ کرنے کے بعد اب ہمیں صرف ان کفار کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیے جو دارالکفر میں مقیم ہوں۔

۱۔ باج گذار

وہ کفار جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہوں اور جن کو اپنے ملک میں احکام کفر جاری کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ ان کا ملک اگرچہ دارالکفر ہے مگر دارالحرب نہیں۔ اس لیے کہ جب مسلمانوں نے ادائے خراج پر انہیں امان دے دی تو حربیت مرتفع ہو گئی۔ قرآن میں آیا ہے کہ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ

السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء: ۹۰) یعنی " اگر وہ جنگ سے باز آجائیں اور صلح پیش کریں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی سبیل نہیں رکھی"۔ اسی بنا پر فقہا نے تصریح کی ہے کہ ان کے اموال اور نفوس اور اعراض سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔

وَإِنْ وَقَعَ الصُّلْحُ عَلَى أَنْ يُؤَدُّوا إِلَيْهِمْ كُلَّ سَنَةٍ مِائَةَ رَأْسٍ فَإِنْ كَانَتْ هٰذِهِ الْمِائَةُ الرَّأْسِ يُؤَدُّونَهَا مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَوْلَادِهِمْ لَمْ يَصْلُحْ هٰذَا لِأَنَّ الصُّلْحَ وَقَعَ عَلَى جَمَاعَتِهِمْ فَكَانُوا جَمِيعًا مُسْتَأْمَنِينَ وَاسْتِرْقَاقُ الْمُسْتَأْمَنِ لَا يَجُوزُ۔ (المبسوط للامام السرخسی ج ۱۰۔ ص ۸۸)

اور اگر ان سے اس بات پر صلح ہوئی ہو کہ وہ ہر سال سو غلام دیں گے تو یہ سو غلام اگر خود انہی کی جماعت میں سے ہوں یا ان کی اولاد ہوں تو ان کا لینا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ صلح کا اطلاق ان کی پوری جماعت پر ہوا ہے اور وہ سب مستامن ہیں اور مستامن کو غلام بنانا جائز نہیں۔

وَلَوْ دَخَلَ مِنْهُمْ دَارَ حَرْبٍ أُخْرَى فَظَهَرَ الْمُسْلِمُونَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَتَعَرَّضُوا لَهُ لِأَنَّهُ فِي أَمَانِ الْمُسْلِمِينَ۔

(ایضاً ص ۸۹)

اگر ان میں سے کوئی شخص کسی دوسرے دار الحرب میں مقیم ہو اور اسلامی فوجیں اس ملک میں داخل ہوں تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا کیوں کہ وہ مسلمانوں کی امان میں ہے۔

وَإِنْ كَانَ الَّذِينَ سَبَوْهُمْ قَوْمٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ غَدَرُوا بِأَهْلِ الْمُوَادَعَةِ لَمْ يَسَعِ الْمُسْلِمِينَ أَنْ يَشْتَرُوا مِنْهُمْ وَرُدَّتِ الْبَيْعُ لِأَنَّهُمْ كَانُوا فِي أَمَانِ الْمُسْلِمِينَ۔ (ایضاً ص ۹۷)

اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت ان کے ساتھ غدر کر کے ان کے

آدمیوں کو غلام بنالے تو مسلمانوں کے لیے ان غلاموں کا خریدنا جائز نہ ہو گا اور اگر انہوں نے خرید لیا تو اس بیع کو رد کر دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی امان میں تھے۔

اس قسم کے کفار اگرچہ نظری حیثیت سے اہل حرب ضرور رہتے ہیں لانھم بھذہ الموادعۃ لا یلتزمون احکام الاسلام ولا یخرجون من ان یکونوا اھل حرب[1]۔ (المبسوط ج ۱۰ ص ۸۸) لیکن ان کے اموال مباح نہیں اور ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ سود خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ اگر وہ اپنے دار میں بھی نہ ہوں، کسی ایسے دار میں ہوں جہاں بالفعل جنگ ہو رہی ہو تب بھی مسلمانوں کے لیے ان سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہ ہو گا۔

۲۔ معاہدین

وہ کفار جن سے دارالاسلام کا معاہدہ ہو۔ ان کے متعلق قرآن کی تصریحات حسب ذیل ہیں:۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ۔ (التوبۃ: ۴)

مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کر لیا اور انہوں نے تمہارے ساتھ وفائے عہد میں کمی بھی نہ کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان کے ساتھ تم معاہدہ کی مدت مقررہ تک عہد پورا کرو۔

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ۔ (التوبۃ: ۷)

پھر جب تک وہ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔

---

[1] کیونکہ اس صلح و معاہدہ سے وہ احکام اسلام کی پیروی کے پابند تو ہو نہیں جاتے اس لیے وہ اہل حرب ہونے سے خارج نہیں ہوتے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ (الانفال: ۷۲)

اور جو مسلمان دارالکفر میں رہتے ہوں وہ اگر دین کے حق کی بنا پر تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرو مگر کسی ایسی قوم کے خلاف ان کی مدد نہ کرو جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ (النساء: ۹۲)

اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو دیت دی جائے گی۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ معاہد کفار اگرچہ نظری حیثیت سے حربی ہیں اور ان کے ملک پر دارالحرب کا اطلاق ہو سکتا ہے، مگر جب تک اسلامی حکومت نے ان سے معاہدانہ تعلقات قائم رکھے ہیں، وہ مباح الدم والاموال نہیں ہیں اور ان کی جان و مال سے تعرض کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان کا خون بہائے گا تو دیت لازم آئے گی، اور اگر ان کے مال سے تعرض کرے گا تو ضمان دینا ہوگا۔ پس جب ان کے اموال مباح ہی نہیں ہیں تو ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کا جواز تو اباحت ہی کی اصل پر مبنی ہے۔

۳-اہل غدر

وہ کفار جو معاہدہ کے باوجود معاندانہ رویّہ اختیار کریں۔ ان کے متعلق قرآن کا حکم یہ ہے کہ:-

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ (الانفال: ۵۸)

اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک

دو [1]

شمس الائمہ سرخسی اس صورت مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وَلٰكِنْ يَنْبَغِيْ اَنْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اَيْ عَلٰى سَوَآءٍ مِنْكُمْ وَمِنْهُمْ فِي الْعِلْمِ بِذَالِكَ فَعَرَفْنَا اَنَّهٗ لَا يَحِلُّ قِتَالُهُمْ قَبْلَ النَّبْذِ وَقَبْلَ اَنْ يَعْلَمُوْا بِذَالِكَ۔ (المبسوط ج ۱۰ ص ۸۷)

(ایسی صورت میں معاہدہ کو توڑ دینا جائز ہے) مگر لازم ہے کہ نقض معاہدہ برابری کے ساتھ ہو، یعنی تمہاری طرح ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ تم نے معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ اس حکم سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اعلان و اطلاع سے پہلے ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال نہیں ہے۔

یہ آیت اور اس کی مذکورۂ بالا قانونی تعبیر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ معاہد قوم اگر بدعہدی بھی کرے تب بھی اعلان جنگ سے پہلے اس کے نفوس و اموال مباح نہیں ہیں۔[2]

---

[1] یعنی علی الاعلان معاہدہ ختم ہونے کی اطلاع انہیں دے دو تاکہ اس علم میں تم اور وہ برابر ہو جائیں کہ معاہدہ اب باقی نہیں ہے۔

[2] اس حکم سے صرف وہ حالت مستثنٰی ہے جب کہ کسی معاہد قوم نے علانیہ اپنا معاہدہ توڑ دیا ہو اور صریح طور پر ہمارے حقوق پر کوئی دست درازی یا ہمارے خلاف کوئی محاربانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی حالت میں ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم بھی اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کریں۔ فقہائے اسلام نے اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے استشہاد کیا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپ نے پھر انہیں فسخ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تمام حالات کو سامنے رکھیں (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

۴۔ غیر معاہدین

وہ کفار جن سے معاہدہ نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کو ہمیشہ بین الاقوامی تعلقات میں جنگ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی تعلقات کا انقطاع (Rupture of Diplomatic Relations) دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ دونوں قومیں اب

(جن میں حضورؐ نے نبذ عہد کو ضروری نہ سمجھا) اور اس پورے طرز عمل کی پیروی کریں جو ایسی حالت میں آپؐ نے اختیار کیا۔

اوّلاً:۔ قریش کی خلاف ورزی عہد ایسی صریح تھی جس کے نقض عہد ہونے میں کسی قسم کا التباس نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ فی الواقع ان سے بدعہدی کا فعل سرزد ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا جس کے صاف معنی یہ تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ بات ضروری نہیں ہے کہ خود ناقض عہد قوم کی طرف سے بھی نقض عہد کا اعتراف ہو، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کا نقض عہد بالکل غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحۃً یا اشارۃً یا کنایۃً کوئی ایسا فعل نہیں کیا جس سے یہ ایماء نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپؐ ابھی تک قریش کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً:۔ قریش کے خلاف جنگی کارروائی آپ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپ کے طرز عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح و بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال کیا ہو ـــــ یہ اس معاملہ میں حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کے حکم فانبذ الیہم علیٰ سواء سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو صرف اُن حالات میں اور اس طرح کی جاسکتی ہے جن میں اور جس طرح حضورؐ نے ایسی کارروائی کی۔

باہمی احترام کی قیود سے آزاد ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ایک قوم دوسری قوم کے آدمیوں کو قتل کر دے یا لوٹ لے تو کوئی دیت یا ضمان واجب نہ ہوگا۔ اس معنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں قوموں کے لیے ایک دوسرے کے نفوس و اموال مباح ہیں۔ مگر کوئی مہذب حکومت باقاعدہ اعلان جنگ کیے بغیر کسی انسانی جماعت کا خون بہانا یا مال لوٹنا پسند نہیں کر سکتی۔ اسلامی قانون اس باب میں یہ ہے:۔

ولو قاتلوھم بغیر دعوۃ کانوا آثمین فی ذٰلک ولکنھم لا یضمنون شیئاً مما اتلفوا من الدماء و الاموال عندنا۔ (المبسوط ج۱۰ص۳۰)

اگر مسلمانوں نے دعوت[1] کے بغیر ان سے جنگ کی تو گناہ گار ہوں گے۔ لیکن ایسی جنگ میں ان کی جان و مال کا جو اتلاف وہ کریں گے اس میں سے کسی چیز کا ضمان حنفیہ کے نزدیک مسلمانوں پر لازم نہ آئے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ضمان لازم آئے گا کیونکہ جب تک وہ دعوت کو رد نہ کریں ان کی جان و مال کی حرمت و عصمت باقی ہے۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں:۔

ولکنا نقول العصمۃ المقومۃ تکون بالاحراز وذٰلک لم یوجد فی حقھم...... ولکن شرط الاباحۃ تقدیم الدعوۃ فبدونہ لا یثبت ومجرد حرمۃ القتل لا یکفی بوجوب الضمان۔ (ایضاً ص ۳۰-۳۱)

جس عصمت کی بنا پر جان و مال کی قیمت قائم ہوتی ہے تو وہ دارالاسلام

---

[1] دعوت سے مراد یہ ہے کہ ان کو الٹی میٹم دیا جائے کہ یا تو ہم سے صلح و معاہدہ کر و یا جزیہ دو یا مسلمان ہو کر ہماری قومیت میں شامل ہو۔ اگر ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت تم قبول نہیں کرتے تو ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔

کی حفاظت میں ہونے پر موقوف ہے اور یہ چیز ان کے حق میں موجود نہیں ہے ۔۔۔۔۔ یہ ضرور ہے کہ اباحت کے لیے تقدیم دعوت شرط ہے، اس کے بغیر اباحت ثابت نہیں ہوتی، لیکن محض حُرمتِ قتل، وجوب ضمان کے لیے کافی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حربی کفار جو ذمّی نہیں ہیں، جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے، جن کا دار ہمارے دار سے مختلف ہے جن کی عصمت ہمارا قانون تسلیم نہیں کرتا، اُن کے نفوس و اموال بھی ہم پر اس وقت تک حلال نہیں ہیں جب تک کہ اتمام حجت نہ ہو اور ہمارے اور ان کے درمیان باقاعدہ اعلانِ جنگ نہ ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں حضرت معاذ بن جبل کو جو ہدایات دی تھیں وہ قابلِ غور ہیں:-

لَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى تَدْعُوْهُمْ فَاِنْ اَبَوْا فَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى يَبْدَؤُوْا فَاِنْ بَدَؤُوْا فَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى يَقْتُلُوْا مِنْكُمْ قَتِيْلًا ثُمَّ اَرُوْهُمْ ذٰلِكَ الْقَتِيْلَ وَقُوْلُوْا لَهُمْ هَلْ اِلٰى خَيْرٍ مِّنْ هٰذَا سَبِيْلٍ فَلَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى يَدَيْكَ خَيْرٌ مِّمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ وَغَرَبَتْ۔

ان سے جنگ نہ کرنا جب تک کہ ان کو دعوت نہ دے لو۔ پھر اگر وہ انکار کریں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک وہ ابتدا نہ کریں۔ پھر اگر وہ ابتدا کریں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کر دیں۔ پھر اس مقتول کو دکھا کر ان سے کہنا کہ کیا اس سے زیادہ بہتر کسی بات کے لیے تم آمادہ نہیں ہو سکتے؟ اے معاذ اس قدر صبر و تحمل کی تعلیم اس لیے ہے کہ اگر اللہ تیرے ہاتھ پر لوگوں کو ہدایت بخش دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تیرے قبضہ میں مشرق سے مغرب تک کا سارا ملک و مال آ جائے۔

۵۔ محاربین

اب صرف وہ کفار باقی رہ جاتے ہیں جن سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو۔ اصلی حربی یہی ہیں۔ انہی کے دار کو تعلقات خارجیہ کے قانون میں "دارالحرب" کہا جاتا ہے انہی کے نفوس اور اموال مباح ہیں اور انہی کو قتل کرنا، گرفتار کرنا، لوٹنا اور مارنا شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن حربیت (Enemy Character) تمام محاربین میں یکساں نہیں ہے اور نہ تمام اموال حربیہ ایک ہی حکم میں ہیں۔ حربی کافروں کی عورتیں، ان کے بچے، ان کے بیمار، ان کے بوڑھے اور اپاہج وغیرہ بھی اگرچہ حربی ہیں، مگر شریعت نے ان کو مباح الدم نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ اباحتِ قتل کو صرف مقاتلین (Combatants) تک محدود رکھا ہے۔ انما یقتل من یقاتل۔ قال اللہ تعالیٰ وقاتلوھم والمفاعلۃ تکون من الجانبین[1] (المبسوط ج ۱۰ ص ۶۴) اسی طرح اموال حربیہ میں بھی شریعت نے فرقِ مدارج کیا ہے اور ہر درجہ کے احکام الگ ہیں۔

اموال حربیہ کے مدارج اور احکام

اگرچہ اصولی حیثیت سے تمام وہ اموال و املاک جو دشمن کے علاقہ میں ہوں، مباح (Confiscable) ہیں، لیکن شریعت اسلامی نے ان کو دو اقسام پر منقسم کیا ہے، ایک غنیمت دوسرے فئے:۔

غنیمت

وہ اموال منقولہ (Moveable Properties) جن پر رقبۂ جنگ میں اسلامی فوج اپنے اسلحہ کی طاقت سے قابض ہو، اموال غنیمت ہیں۔ ان کا $\frac{1}{5}$ حصہ (یعنی خمس) حکومت کا حق ہے اور $\frac{4}{5}$ ان لوگوں کا حق جنہوں نے انکو لوٹا ہو۔ امام ابویوسف رحمہ اللہ

---

[1] قتل صرف وہ کیا جائے گا جو ہم سے مقاتلہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقاتلوھم (مقاتلہ کرو) فرمایا ہے، اور مقاتلہ جانبین سے ہوتا ہے، نہ کہ صرف ایک جانب سے۔

کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

فَهٰذَا فِيمَا يُصِيبُ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ عَسَاكِرِ اَهْلِ الشِّرْكِ وَمَا اَجْلَبُوْا بِهٖ مِنَ الْمَتَاعِ وَالسِّلَاحِ وَالْكُرَاعِ۔ (ص ۔ ۱۰)

خمس ان اموال میں ہے جو مسلمانوں کو اہل شرک کے لشکروں سے ہاتھ لگیں اور جو ساز و سامان اور اور جانوروں کی قسم سے ہوں (یعنی اموال منقولہ)

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:۔

فَمَا اَصَابَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ عَسَاكِرِ اَهْلِ الشِّرْكِ وَمَا اَجْلَبُوْا بِهٖ مِنَ الْمَتَاعِ وَالْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ وَغَيْرِ ذَالِكَ۔

اس سے ظاہر ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کارروائی (War like operations) کے دوران میں غنیم کے لشکروں سے حدود سے باہر عام آبادیوں کو لوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔ اگرچہ دار الحرب کے تمام اموال مباح ہیں اور اگر کوئی شخص غیر مقاتلین کے اموال سے تعرض کرے تو اس پر نہ کوئی ضمان لازم ہوگا، نہ لوٹے ہوئے اموال واپس کیے جائیں گے، لیکن اس قسم کی لوٹ مار پسندیدہ نہیں ہے۔ امام مسلمین ہر ممکن طریقہ سے اپنی فوجوں کو ایسی حرکات سے روکے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

مَنْ غَزَا فَخْرًا وَرِيَاءً وَسُمْعَةً عَصَى الْاِمَامَ وَاَفْسَدَ فِي الْاَرْضِ فَاِنَّهٗ لَمْ يَرْجِعْ بِالْكَفَافِ[۱]

(ابوداود باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا)

---

[۱] جس شخص نے فخر کی نیت سے، اور دنیا کو اپنی قوت و شجاعت دکھانے کے لیے اور ناموری حاصل کرنے کے لیے جنگ کی اور امام کی نافرمانی کی، اور زمین میں فساد برپا کیا، اسے اجر ملنا تو درکنار وہ تو برابر بھی نہ چھوٹے گا۔

فَے

دوسری قسم ان اموال منقولہ و غیر منقولہ کی ہے جو غنیم کے لشکر سے لڑ کر حاصل نہ کیے گئے ہوں، بلکہ نتیجۂ فتح کے طور پر حکومت کے زیر تصرف آئیں، عام اس سے کہ وہ غنیم کی رعایا کے املاک ہوں یا دشمن سلطنت کے ہوں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے اموال کو "فَے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ غنیمت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وغنیمة العسکر مخالفة لما افاء الله من اهل القری والحکم فی هذا غیر الحکم فی تلک الغنائم۔[1] (کتاب الخراج ص ۳۸) اس کے متعلق سورہ حشر میں تشریح کر دی گئی ہے کہ یہ کسی شخص کی ملکیت میں نہ دی جائے گی بلکہ اس کا تعلق بیت المال سے ہوگا اور اسے مصالح عامہ میں خرچ کیا جائے گا۔ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (الی آخر الآیة)۔

لفظ "فَے" کا کوئی اور مفہوم اس کے سوا نہیں ہے اور کتب فقہیہ میں ہم کو کہیں بھی کسی ایسی "فَے" کا نشان نہیں ملا جس کو ہر شخص بطور خود حاصل کرے اور اپنی ہی جیب میں رکھ لے۔ جگہ جگہ فیئ للمسلمین، فیئ یوضع فی بیت مال المسلمین، فیئ لجماعة المسلمین اور ایسے ہی دوسرے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین صرف اُس "فَے" سے واقف تھے جو جماعت کی ملک ہوتی ہے اور حکومت اسلامی کے زیر تصرف ہوا کرتی ہے۔

غنیمت اور لوٹ میں امتیاز

غنائم حاصل کرنے کا شرعی حق صرف اُنہی لوگوں کو دیا گیا ہے جو اسلامی سلطنت کے زیر حفاظت ہوں اور جن کو امام مسلمین کی اجازت نصاً یا حکماً ہو۔ ان کے سوا اگر عام مسلمان فرداً فرداً یا جماعت بنا کر بطور خود لوٹ مار کرنے لگیں تو ان کی حیثیت لٹیروں کی

---

[1] اگر ایسے لوگ جن کو امام کی حمایت حاصل نہ ہو امام کی اجازت کے بغیر غنیم کے علاقہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر داخل ہوں اور مال لوٹیں تو ہمارے نزدیک اس مال میں سے خمس نہ لیا جائیگا، بلکہ وہ مال انہی لوگوں کیلئے مخصوص ہوگا۔

ہو گی۔ ان کی غنیمت "غنیمت" نہ ہو گی، لُوٹ ہو گی۔ اس لیے اس میں سے اللہ کا حصّہ (یعنی خمس) قبول نہ کیا جائے گا۔ البتہ وہ انہی کے پاس رہنے دیا جائے گا، کیوں کہ دشمن کو واپس دلانا تو بہر حال ممکن نہیں ہے فان کان دخول القوم الذین لامنعة لهم بغیر اذن الامام علیٰ سبیل التلصص فلا خمس فیما اصابوا عندنا ولکن من اصاب منهم شیئاً فهو له خاصّة (المبسوط ج۔۱۰ ص ۷۴) اس کی وجہ جو کچھ علامہ سرخسی نے لکھی ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

فَالْمَعْنٰی مَا بَیَّنَّا اَنَّ الْغَنِیْمَةَ اِسْمٌ لِمَالٍ مصاب باشرف الجهات وهو ان یکون فیه اعلاءِ کلمةِ اللّٰه تعالےٰ واعزاز الدِّین ولهٰذا جَعَلَ الخُمُسَ منه للّٰه تعالیٰ وهٰذا المعنی لا یَحْصِل فیما یَأْخُذ ه الواحد علیٰ سبیل التلصص فیتمحض فعله اکتسابًا لِلْمَالِ۔ (ایضاً۔ ۷۴)

بات دراصل یہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ غنیمت اس مال کا نام ہے جو انتہا درجہ کے پاک اور اشرف طریقہ سے ہاتھ آئے اور وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کے کلمہ کا اعلاء اور اس کے دین کا اعزاز ہو۔ اسی لیے اس میں اللہ کا پانچواں حصّہ مقرر کیا گیا۔ یہ بات اُس مال میں نہیں ہوتی جس کو ایک شخص چوروں کی طرح حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد تو محض اکتساب مال ہے۔

اس کی نظیر میں امام سرخسی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں ذکر ہے کہ مشرکین ایک مسلمان لڑکے کو پکڑ لے گئے تھے۔ کچھ مدّت بعد وہ لڑکا ان کے قبضہ سے بھاگ نکلا اور ان کی کچھ بکریاں بھی پکڑ لایا۔ حضورؐ نے یہ بکریاں اسی کے پاس رہنے دیں اور ان میں سے خمس لینا قبول نہ کیا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، کا واقعہ بھی اسی کی تائید میں ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کا مال لوٹ کر مدینہ حاضر ہوئے اور اسلام پر ایمان لائے جب انہوں نے لُوٹ کا مال حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہارا

اسلام مقبول ہے مگر یہ مال مقبول نہیں۔

دارالحرب میں کفار کے حقوق ملکیت

غنیمت پر تیسری قید یہ لگائی گئی ہے کہ غانمین جب تک دارالحرب میں مقیم ہیں اس وقت تک وہ اموال غنیمت سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس قید سے صرف سامان خورد و نوش اور جانوروں کا چارہ مستثنیٰ ہے۔ یعنی دوران جنگ میں جس قدر آذوقہ اور چارہ فوجوں کے ہاتھ لگے گا اس میں سے ہر مجاہد بقدر حاجت لے سکتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام اموالِ غنیمت سردار لشکر کے پاس جمع کر دیئے جائیں گے اور ان کو غانمین میں اُس وقت تک تقسیم نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ دار الاسلام کی طرف منتقل نہ کر دیئے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اموال غنیمت جب تک دارالحرب میں ہوں غانمین کی مِلک ان پر مکمل نہیں ہوتی۔ امام شافعیؒ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محاربین کا مال مباح ہے اس لیے جس وقت مجاہدین اسلام ان پر قابض ہوئے اسی وقت ان کے مالک بھی ہو گئے۔ مگر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ مِلک ضعیف ہے۔ گو ہمارا قبضہ ہو چکا ہے لیکن دار تو ان کا ہے۔ جب تک مال اُن کے دار سے ہمارے دار میں نہ چلا جائے ہم پوری طرح اس کے مالک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تکمیلِ ملک کے لیے محض استیلاء (Occupation) کافی نہیں ہے۔ امام سرخسی اس مسئلہ میں حنفیہ کے مسلک کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:-

> فاما عندنا الحقُّ یثبتُ بنفسِ الاخذِ ویتاکد بالاحراز ویتمکن بالقسمۃِ کحقِ الشفیعِ یثبت بالبیعِ ویتاکد بالطلبِ ویتم الملکُ بالاخذِ وما دام الحق ضعیفًا لاتجوز القسمۃ .... بالاخذِ یملکُ الاراضی کما یملک الاموال ثم لایتاکد الحق فِی الارضِ التی نزلوا فیھا اذا لم یصیروھا دار الاسلامِ۔

(المبسوط ج ۱۰ ص ۳۳)

ہمارے نزدیک نفس قبضہ سے حق صرف ثابت ہوتا ہے، دار الاسلام میں لے جانے سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور تقسیم غنیمت سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال شفعہ کی سی ہے کہ شفیع کا حق بیع سے ثابت ہوتا ہے، طلب سے موکد ہوتا ہے اور قبضہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ پس جب تک حق ضعیف رہے تقسیم جائز نہیں ہوتی۔ جس طرح اموال (جائداد منقولہ) پر نفس قبضہ سے ملک ثابت ہوتی ہے اسی طرح اراضی (جائداد غیر منقولہ) پر بھی قبضہ سے ملک ثابت ہو جاتی ہے، مگر جس سرزمین میں مسلمانوں کے لشکر اُترے ہوں اس پر حق اس وقت تک پوری طرح قائم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو دار الاسلام نہ بنا دیا جائے۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ نہ صرف غنیمت، بلکہ فَے میں بھی اسلامی حکومت اس وقت تک تصرف کا پورا حق نہیں رکھتی جب تک کہ علاقہ مقبوضہ (Occupied Territory) کو دار الاسلام نہ بنا دیا جائے، یا باصطلاح جدید اپنے مقبوضات کے ساتھ اس کے الحاق (Annexation) کا باقاعدہ اعلان نہ کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اسی مسلک کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ مکحول کا بیان ہے کہ ماقسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغنائم الا فی دار الاسلام (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی غنائم کو دار الاسلام کے سوا کہیں تقسیم نہیں فرمایا)۔ محمد بن اسحاق اور کلبی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے حُنین کے غنائم واپسی جعرانہ میں تقسیم فرمائے تھے جو اس زمانہ میں دار الاسلام کی سرحد پر تھا۔ راستہ میں اعراب نے تقسیم کا سخت مطالبہ کیا اور حضورؐ کو اس قدر پریشان کیا کہ آپؐ کی چادر پھٹ گئی، مگر اس ہنگامہ کے باوجود آپؐ نے دار الاسلام کے حدود میں پہنچنے سے پہلے مال غنیمت کا ایک حبہ تقسیم نہ فرمایا۔

رسولِ خدا کے اس طرزِ عمل اور فقہاء کی ان توجیہات پر غور کیجیے۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ معلوم ہو گا کہ اسلامی قانون جس طرح اسلامی مقبوضات پر اہل اسلام کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح غیر اسلامی مقبوضات پر اہل حرب کے حقوقِ مالکانہ کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ہاں اگرچہ جنگ ان کے اموال کو ہمارے لیے مباح کر دیتی ہے۔ مگر شریعت نے ہم کو اس اباحت سے فائدہ اٹھانے کی عام اور غیر مشروط اجازت نہیں دے دی ہے۔ بلکہ ان کی ملک سے ہماری ملک میں اموال کے منتقل ہونے کی چند باضابطہ قانونی شکلیں مقرر کی ہیں اور وہ ایسی شکلیں ہیں جن میں ہمارے اور اہل کفر کے درمیان پوری مساوات ہے۔ حنفی قانون کہتا ہے کہ ہم ان کے اموال کے مالک اس وقت ہوں گے جب باقاعدہ جنگ میں ان پر قبضہ کر کے انہیں اپنے "دار" میں لے آئیں۔ اسی طرح وہ بھی جب ہمارے اموال پر جنگ کے ذریعہ سے قابض ہو کر اپنے دار میں انہیں لے جائیں گے تو ان کے مالک ہو جائیں گے، اور ان کے دار میں ان کے حقوق مالکانہ کا احترام کرنا ہم پر لازم ہو گا۔ اس بارے میں فقہاء کی مزید تصریحات قابلِ غور ہیں۔

نفس الاخذ سببٌ للملكِ المالِ اذا تمّ بالاحراز وبيننا وبينهم مُسَاوَاتٌ فى اَسْبَابِ اصابةِ الدنيا بل حظهم اوفر من حظنا لانّ الدُّنْيَا لهم ولانّهُ لا مقصُودَ لهم فى هٰذهِ الاَخذِ سوى اكتِسَابِ المالِ ونحن لا نقصد بالاخذِ اكتسابَ المالِ (المبسوط ج ۱ص ۵۳)

جب مال پر قبضہ کر کے اس کو دار میں پہنچا دیا گیا ہو تو یہ اس مال پر حق ملکیت کا پورا سبب ہے اور دنیا حاصل کرنے کے اسباب میں ہمارے اور کفار کے درمیان کامل مساوات ہے۔ بلکہ دنیا میں ان کا حصہ ہمارے حصہ سے کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ ان کے لیے تو دنیا ہی ہے اور اخذِ مال سے ان کا مقصد بجز اکتساب مال کے اور کچھ نہیں بخلاف اس کے ہمارا مقصد اکتسابِ مال نہیں ہے۔

وَإِذَا دَخَلَ المسلم دَارَ الحرب بِأَمَانٍ وَلَهُ فِي أَيْدِيهِمْ جَارِيَةٌ مَاسُورَةٌ كُرِهَتْ لَهُ غَصبها ووطيها لِأَنَّهُمْ مَلَكُوهَا عَلَيْهِ وَالْتَحَقَتْ بِسَائِرِ أملاكهم۔ (ایضاً۔ ص ۶۵)

اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں امان لے کر داخل ہو اور وہاں خود اسی کی لونڈی اس کے ہاتھ آئے جسے کفار پکڑ لے گئے تھے تو اس کے لیے اس لونڈی پر قبضہ کرنا اور اس سے وطی کرنا جائز نہیں کیونکہ اب کفار اس کے مالک ہیں اور وہ لونڈی ان کے املاک میں داخل ہو چکی ہے۔

وَلَوْ خَرَجَ إِلَيْنَا بِأَمَانٍ وَمَعَهُ ذالك المال فَإِنَّهُ لَا يتعرض لَهُ فيه۔ (ایضاً ص ۶۳)

اور اگر کافر حربی ہمارے دار میں امان لے کر آئے اور اس کے ساتھ خود ہم ہی سے لوٹا ہوا مال ہو تو ہم اس سے وہ مال نہیں چھین سکتے۔

فَإِنْ غَلَبَ العدو على مال المسلمين فاحرزوه وهناك مسلم تاجر مستامن حل له ان يشتريه منهم فيأكل الطعام من ذالك ويطاء الجارية لانهم ملكوها بالاحراز فالتحقت بسائر املاكهم وهذا بخلاف ما لو دخل اليهم تاجر بامان فسرق منهم جارية واخرجها لم يحل للمسلم ان يشتريها منه لانه احرزها على سبيل الغدر وهو مامور بردها عليهم فيما بينه وبين ربه وان كان لا يجبره الامام على ذالك۔ (ایضاً ص۔ ۶۱)

اگر دشمن مسلمانوں کے مال پر قابض ہو کر اسے اپنے دار میں لے

جائے اور وہاں کوئی مسلمان تاجر مستامن ہو تو اس کے لیے اس مال کو خریدنا اور کھانا حلال ہے اور وہ ان سے خریدی ہوئی لونڈی سے وطی بھی کرسکتا ہے۔ کیونکہ اپنے دار میں لے جانے کے بعد وہ اس کے مالک ہو گئے اور اب وہ ان کے املاک میں شامل ہے۔ بخلاف اس کے اگر کوئی تاجر امان لے کر دار الحرب میں جائے اور ان کے قبضہ سے کسی لونڈی کو چرا کر دار الاسلام میں لے آئے تو مسلمان کے لیے اس لونڈی کو خریدنا حلال نہیں کیونکہ وہ غدر کر کے اسے لایا ہے۔ اور فیما بینہ و بین اللہ وہ اسے واپس کرنے پر مامور ہے۔ اگرچہ امام اس کو واپس کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔

یہ مسلک ٹھیک ٹھیک حدیث کے مطابق ہے۔ فتح مکہ کے روز جب حضرت علی رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ اپنے اُس مکان میں کیوں نہیں قیام فرماتے جو ہجرت سے پہلے آپؐ کا تھا تو حضورؐ نے جواب دیا کہ ھل ترک لنا عقیل من ربع۔ "عقیل نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے؟" اس کے معنی یہ ہیں کہ جب آپؐ اسے چھوڑ کر نکل گئے تھے اور عقیل بن ابی طالب نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، تو اُس پر سے آپؐ کی ملک ساقط اور عقیل کی ملکیت ثابت ہو گئی۔ اب باوجود اس کے کہ آپؐ نے مکہ فتح کر لیا تھا، آپؐ نے اپنے سابق حقوق ملکیت کی بنا پر اس مکان کو اپنا مکان قرار دینے سے خود انکار فرما دیا۔

مباحث گزشتہ کا خلاصہ

یہ تمام قانونی تصریحات آپ کے سامنے ہیں ان پر غور کرنے سے حسب ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) دار الحرب اگر مطلقاً دار الکفر (Foreign territory) کے معنی میں لیا جائے تو اس کے اموال مباح نہیں بلکہ صرف غیر معصوم ہیں اور عدم عصمت کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ اسلامی حکومت اس دار میں کسی جان یا مال کے تحفظ کی ذمہ دار

نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی مسلمان کسی مسلم یا غیر مسلم کو جان و مال کا نقصان پہنچائے گا یا اس کی مِلک سے کوئی چیز حرام طریقہ سے نکال لے گا تو یہ اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ اسلامی حکومت اس سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گی۔

(۲) دارالحرب سے مراد اگر ایسے کفار کا دار لیا جائے جن کے نفوس و اموال مباح ہیں تو اس معنی میں ہر دارالکفر دارالحرب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ علاقہ دارالحرب ہے جس سے بالفعل دارالاسلام کی جنگ ہو۔ اس خاص نوع کے دارالکفر کے سوا کسی دوسرے دارالکفر کے باشندے نہ مباح الدم ہیں اور نہ مباح المال، اگرچہ وہ ذمی نہیں ہیں اور ان کے نفوس و اموال غیر معصوم ہیں۔

(۳) جس ملک سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو اس کے نفوس و اموال بھی مطلقاً ایسے مباح نہیں ہیں کہ ہر شخص وہاں لوٹ مار کرتے اور کفار کی املاک پر قبضہ کرنے کا مختار ہو۔ بلکہ اس کے لیے بھی کچھ شرائط اور قیود ہیں:-

(الف) امام مسلمین باقاعدہ اعلانِ جنگ کر کے اس ملک کو دارالحرب قرار دے، اور

(ب) وہاں جنگ کرنے والوں کو امام کا "اذن" اور اس کی "حمایت" حاصل ہو۔

(۴) غنیمت صرف اُس جائداد منقولہ کو کہتے ہیں جو دشمن کے عساکر سے لڑ کر حاصل کی جائے۔ یا بالفاظ دیگر اشرف جہات سے حاصل ہو اور جس میں دین کا اعزاز ہو۔ اس مال میں پانچواں حصّہ اللہ کے لیے ہے۔

(۵) فَے اُن اموال منقولہ و غیر منقولہ کو کہتے ہیں جو نتیجۂ فتح کے طور پر حکومتِ اسلامی کے قبضہ میں آئیں۔ خراج اور مالِ صلح وغیرہ کا شمار بھی فَے ہی میں ہے، لیکن یہ بالکلیہ اسلامی حکومت کی ملک ہے، اور کسی شخص خاص کو اس پر حقوقِ ملکیت حاصل نہیں ہو سکتے۔

(۶) فَے اور غنیمت کے اموال پر فاتحین کو پورے حقوقِ ملکیت صرف اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب کہ وہ ان کو دارالحرب سے دارالاسلام منتقل کر لائیں

یا دار الحرب کو دار الاسلام بنالیں - اس سے پہلے ان اموال میں تصرف کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے -

(۷) اسلامی قانون حربی کفار کے اموال پر اُن کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے - اور ان کی ملک سے کوئی مال مسلمانوں کی ملک میں جائز طور پر انہی صورتوں سے منتقل ہو سکتا ہے جن کو اللہ اور رسولؐ نے حلال کیا ہے، یعنی بیع یا صلح یا جنگ -

مسلمانوں کی حیثیات بلحاظ اختلافِ دار

ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ اسلامی قانون کے مطابق اختلاف دار کے لحاظ سے خود مسلمانوں میں کیا اختلافات واقع ہوتے ہیں - اس باب میں تمام قوانین کی بنیاد حسب ذیل آیات و احادیث پر قائم ہے -

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا۔ (الانفال: ۷۲)

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام) نہیں آگئے، اُن سے تمہارا "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں تا وقتیکہ وہ (دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف) ہجرت نہ کریں -

فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔

(النساء: ۸۹)

ان کو ولی نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں -

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ۔ (النساء: ۹۲)

جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے اس کو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیئے اور اس کے وارثوں کو دیت دینی چاہیئے الایہ کہ ورثا صدقہ کے طور پر دیت چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہو اور ہو وہ مومن تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو دیت دی جائے اور ایک مسلمان بردہ آزاد کیا جائے۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا بَرِيٌّ مِّنْ كُلِّ مُسْلِمٍ اَقَامَ بَيْنَ اظهر المشركين۔ وعن النبي صلى الله عليه وسلم ايضًا مَنْ اَقَامَ مَعَ المشركين فقد بَرِئَتْ مِنه الذمة اوقال لَاذِمَّةَ لَهُ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ہر اس مسلمان کی ذمہ داری سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔ اور حضور ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ جس نے مشرکین کے ساتھ قیام کیا اس سے بری الذمہ ہوں۔ یا فرمایا اس کے لیے کوئی ذمہ نہیں۔

ابو داؤد کی کتاب الجہاد میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو لشکر کا سردار مقرر کر کے بھیجتے تو اس کو منجملہ دوسری ہدایات کے ایک یہ ہدایت بھی فرماتے تھے :۔

اُدْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ فَاِنْ اَجَابُوْكَ فَاقبل منهم

لہ "میں" کا لفظ آپ نے حکومت اسلامی کے رئیس کی حیثیت سے فرمایا ہے نہ کہ رسول کی حیثیت سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایسے مسلمان کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہے۔

وكفّ عنهم، ثم ادعهم إلى التحوّل من دارهم إلى دار المهاجرين واخبرهم انهم إن فعلوا ذالك ان لهم ما للمهاجرين وان عليهم ما على المهاجرين فان أبوا واختاروا دارهم فاعلمهم انهم يكونون كاعراب المسلمين يجري عليهم حكم الله الذي كان يجري على المؤمنين ولا يكون لهم في الفيء والغنيمة نصيب الا أن يجاهدوا مع المسلمين (باب فى دعاء المشركين)

ان کو پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا۔ اگر وہ قبول کر لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا۔ پھر ان سے کہنا کہ اپنے دار کو چھوڑ کر مہاجرین کے دار یعنی دار الاسلام میں آجائیں اور انہیں بتا دینا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اور وہی واجبات ان پر عائد ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی دار میں رہنا اختیار کریں تو انہیں آگاہ کر دینا کہ ان کی حیثیت اعراب مسلمین کی سی ہو گی ان پر اللہ کے وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو مومنین پر جاری ہوتے ہیں مگر فَے اور غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اِلّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔

ان آیات و احادیث فقہاء حنفیہ نے جو احکام مستنبط کیے ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ دار الاسلام کے مسلمان

جو نفوس و اموال دار الاسلام[1] کی حدود میں ہوں صرف انہی کی حفاظت حکومت

---

[1] ابتدائی زمانہ میں جب تمام اسلامی مقبوضات ایک ہی حکومت کے ماتحت تھے تو دار الاسلام خلیفۂ اسلام کے حدودِ سلطنت کا ہم معنی تھا۔ مگر اسلام کے دستوری (باقی ص ۳۳۵ پر)

اسلامی کے ذمہ ہے۔ اور جو مسلمان دارالاسلام کی رعایا ہوں دینی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ دنیوی حیثیت سے بھی اسلام کے تمام قوانین ان پر نافذ ہوں گے اور وہی کلی طور پر احکام کے ملتزم ہوں گے۔ یہ قاعدہ اسلامی قانون کے قواعد کلیہ میں سے ہے اور اس پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

(۱) اسی قاعدہ کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ عصمتِ نفوس و اموال و اَعراض صرف انہی مسلمانوں کی عصمت محض دینی عصمت ہے، عصمت مقومہ نہیں ہے جس کی بنا پر قضا شرعی لازم آتی ہے کما قال السرخسی فی کتابہ المبسوط العصمۃ المقومۃ تکون بالاحراز (جلد ۱۰، ص ۳۰) والعصمۃ بالاحراز بالدار لا بالدین (ایضاً ص ۵۳)

بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵ سے) قانون کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے وہ ایسے ہیں کہ جب دارالاسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو خود بخود دولت مشترکہ (Comman wealth) کا تصور پیدا ہو گیا ہر اسلامی مقبوضہ خواہ وہ دنیا کے کسی حکمران کے ماتحت ہو، بہر حال دارالاسلام کا ایک جزو ہے۔ اور ہر مسلمان خواہ وہ کہیں پیدا ہوا ہو، دارالاسلام میں داخل ہوتے ہی خود بخود اس کی رعیت بن جاتا ہے اور تمام حقوق شہریت (Rights of citizenship) اس کو حاصل ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس نے کسی دارالکفر کے ساتھ رعایا ہونے کا تعلق نہ جوڑ رکھا ہو۔ موجودہ اسلامی حکومتیں خواہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں، لیکن اسلامی قانون کی رُو سے کوئی مسلمان کسی اسلامی حکومت میں غیر ملکی نہیں ہے۔ ایک افغان کے حقوق اور واجبات ترکی اور ایران میں بھی وہی ہونے چاہئیں جو خود افغانستان میں ہیں اور ایک مسلمان کے لیے یہ ہرگز ضروری نہ ہونا چاہیئے کہ اگر وہ ایک اسلامی حکومت کے حدود سے نکل کر دوسری اسلامی حکومت کے حدود میں آباد ہو تو وہاں کی رعیت بننے کے لیے کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرے۔ ہر مسلمان دارالاسلام کا پیدائشی شہری ہے۔

(۲) اسی قاعدہ سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اسلامی قانون افعال کو حرام قرار دیتا ہے ان سے دار الاسلام کے مسلمان دیناً و قضاءً دونوں حیثیتوں سے روکے جائیں گے، مگر جو مسلمان دار الاسلام میں نہیں ہیں ان کا معاملہ ان کے اور خدا کے درمیان ہے، دین کا احترام دل میں ہو تو باز رہیں اور نہ ہو تو جو چاہیں کریں، اس لیے کہ اسلام کو ان پر نفاذِ احکام کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

(۳) یہی قاعدہ اس مسئلہ کا ماخذ بھی ہے کہ جو نفوس و اموال دار الاسلام کی حفاظت میں ہوں وہ سب معصوم ہیں اس لیے ان پر حق شرعی کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے تعدی کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ اس بارے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ تعدی کرنے سے ہر اس شخص کو روکا جائے گا جو احکام اسلام کا تابع ہو چکا ہو عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اور ہر اس شخص کی جان و مال کی حفاظت کی جائے جو دار الاسلام کی حفاظت میں ہو خواہ مسلمان ہو یا کافر۔

لان الدین مانع لمن یعتقدہ حقا للشرع دون من لا یعتقدہ وبقوۃ الدار یمنع عن مالہ من یعتقد حرمتہ ومن لم یعتقدہ المبسوط ۱۴ ص ۵۸) اسی بنا پر دار الاسلام میں کوئی مسلمان مسلمان سے، اور کوئی مسلمان ذمی سے، اور کوئی ذمی مسلمان سے اور کوئی ذمی ذمی سے اور کوئی حربی متامن دوسرے متامن سے سُود پر یا عقود فاسدہ میں سے کسی عقد فاسدہ پر معاملہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ سب کے اموال سب کے لیے معصوم ہیں اور ان کو صرف انہی طریقوں سے لیا جاسکتا ہے جو اسلامی قانون میں جائز ہیں۔ فَاِنْ دَخَلَ تجارُ اھلِ الحَرْبِ دارَ الاسلامِ بِاَمَانٍ فَاشْتَرٰی اَحَدُھُمْ مِنْ صَاحِبِہٖ دِرْھَمًا بِدِرْھَمَیْنِ لم اجز ذالک الا ما اجیزہٗ بینَ اھلِ الاِسْلَامِ وکذالک اھل الذِّمّۃ اذا فَعَلوا ذالک لان مال کل واحدٍ منھم مَعْصُوْم متقوم (المبسوط ۱۴ ص ۵۸) اسی طرح اگر دار الکفر سے کوئی کافر دار الاسلام میں آئے یا دار الحرب سے کوئی حربی کافر امان لے کر اسلامی ملک میں داخل ہو تو اس سے بھی سُود لینا یا عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ حکومت اسلامی کی امان نے اس کو معصوم الدم و مال کر

دیا ہے اور حکومت اسلامی کی امان کا احترام اس کی تمام رعایا پر واجب ہے۔ البتہ اگر کوئی حربی بغیر امان لیے دارالاسلام میں آجائے تو اس کو پکڑنا، لوٹنا، مارنا، اور اس سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا سب کچھ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ وہ مباح الدم والمال ہے۔ لیکن امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اس سے بھی عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کو جائز نہیں رکھتے۔ (اس پر تفصیلی بحث آگے آتی ہے)

۲۔ مستامن مسلمان دارالکفر اور دارالحرب میں

دارالاسلام کی رعایا میں سے جو شخص عارضی طور پر دارالکفر یا دارالحرب میں امان لے کر جائے اس کو اسلامی اصطلاح میں "مستامن" کہتے ہیں۔ یہ شخص اگرچہ اسلامی حکومت کے حدود قضا (Jurisdiction) سے باہر ہو جانے کی بناء پر ہمارے قانون ملکی کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے، مگر پھر بھی اس کو ایک حد تک اسلامی حکومت کا تحفظ حاصل رہتا ہے، اور التزام احکام اسلامی کی ذمہ داری اس پر سے بالکل ساقط نہیں ہو جاتی۔ ہدایہ میں ہے:-

العصمۃ الثابتۃ بالاحراز بدار الاسلام لاتبطل بعارض الدخول بالامان (کتاب السیر باب مستامن)

دارالاسلام کی حفاظت سے جو عصمت ہوتی ہے وہ عارضی طور پر امان لے کر داخل ہونے سے باطل نہیں ہو جاتی۔

اس قاعدے پر حسب ذیل مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

(۱) جس دارالکفر سے دارالاسلام کا معاہدہ ہو، وہاں مستامن مسلمان کے لیے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں کے کفار مباح الدم والاموال ہی نہیں ہیں، اور جب عقود فاسدہ کے جواز کی بنا اباحت پر رکھی گئی ہے تو اباحت کے مرتفع ہونے سے وہ چیز آپ سے آپ مرتفع ہو جاتی ہے جو اس پر مبنی ہے۔

(۲) اگر کوئی مستامن مسلمان ایسے دارالکفر میں عقود فاسدہ پر معاملہ کرے یا بدعہدی یا غصب اور سرقہ سے کوئی چیز لے کر آجائے تو اسلامی حکومت اس پر

نہ کوئی مقدمہ قائم کرے گی اور نہ اس پر کوئی ضمان لازم[1] ہوگا۔ البتہ دینی حیثیت اس کو ان تمام افعال سے رجوع کا مشورہ دیا جائے گا جو اس نے شریعت کے خلاف کیے ہیں۔

(۳) عقود فاسدہ کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام معاملات میں اس مستامن کے لیے بھی حنفی فقہ کے یہی احکام ہیں جو "دار الحرب" میں امان لے کر داخل ہوا ہو۔

لَوْ دَخَلَ اِلَیْهِمْ تاجر بِاَمَانٍ فَسَرَقَ مِنْهُمْ جاریۃً واخرجها ...... فهو مامُوْر بِرَدِّهَا عَلَیْهِمْ فیما بَیْنَهٗ وَبَیْنَ اللہِ وَاِنْ کَانَ لَا یُجْبِرُہُ الامامُ عَلٰی ذَالِکَ۔ (المبسوط ج ۱۰ ص ۹۱)

اگر کوئی تاجر دار الحرب میں امان لے کر جائے اور ان کے ہاں سے کوئی لونڈی چرا لائے ...... تو فیما بینہ و بین اللہ وہ اُسے واپس کرنے پر مامور ہے اگرچہ امام اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہ کرے گا۔

وَاِذَا دَخَلَ الْمُسْلِمُ دَارَ الْحَرْبِ بِاَمَانٍ فداینهم او دانیوہ او غصبهم او غصبوہ لَمْ یَحْکُمْ فیما بینهم بذالک ...... واِنَّمَا ضَمِنَ المستامنُ لهم ان لا یخونهم واِنَّمَا غَدَرَ بِاَمَانِ نفسه دُوْنَ الْاِمَامِ فیفتی بالرد ولا یجبر علیه فِی الْحُکْمِ۔ (ایضاً ص ۹۵)

اگر دار الحرب میں امان لے کر داخل ہو اور ان سے قرض لے

---

[1] یہ صرف ان صورتوں میں ہے جب کہ معاہدہ میں کوئی شرط اس کے متعلق نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی قانون کے تحت نفس فعل کی بنا پر اس مسلمان سے کوئی بازپرس نہ کی جائے گی۔ بازپرس نہ کی جائے گی۔ بازپرس اگر ہو سکتی ہے یا پھر ان بنیادوں پر ہو سکتی ہے جن پر ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

یا وہ اس سے قرض لیں، یا وہ ان کا مال غصب کر لے یا وہ اس کا مال غصب کر لیں تو ان کے درمیان دار الاسلام میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے گا ...... مستامن نے بطور خود ان سے خیانت نہ کرنے کا ذمہ لیا تھا، اور اب جو اس نے غدر کیا تو یہ امام کے معاہدہ میں نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی معاہدہ میں غدر کیا ہے اس لیے اس کو واپس کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا مگر حکماً اس پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

(امام ابو یوسف کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ مسلمان کو ہر جگہ ملتزم احکام اسلام قرار دیتے ہیں۔

اگر کوئی مستامن مسلمان دار الحرب میں کسی کو قتل کر دے یا اس کے مال کو نقصان پہنچائے تو دار الاسلام میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی، البتہ اس کے دین کے لحاظ سے ایسا کرنا اس کے لیے ناجائز ہے۔ (واکرہ للمسلم المستامن الیھم فی دینہ ان یغدر بھم لان الغدر حرام، ایضاً ص۹۶)

اگر مستامن مسلمان دار الحرب سے غصب کر کے یا چرا کر کوئی مال لے آئے تو مسلمان کے لیے اس کو خرید نا مکروہ ہے۔ لیکن اگر وہ خرید لے تو یہ بیع رد نہ کی جائے گی کیوں کہ قانوناً نفس بیع و شراء میں کوئی نقص نہیں ہے، البتہ اصلاً چونکہ یہ مال غدر ہے اس لیے وہ مسلمان اپنے دین کے لحاظ سے اس کو واپس کرنے پر مامور ہے۔ (والنھی عن الشراء منہ لیس لمعنی عین الشراء فلا یمنع جوازہ وھھنا الکراھۃ لمعنی الغدر وکان مامورًا بردھا علیھم دیناً، ایضاً ص۹۷)

(۴) مستامن مسلمان "دار الحرب" میں اہل حرب سے سود لے سکتا ہے، جوا کھیل سکتا ہے، خمر اور خنزیر اور مردار ان کے ہاتھ بیچ سکتا ہے اور تمام ان طریقوں سے ان کا مال لے سکتا ہے جن پر خود اہل حرب راضی ہوں یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا مذہب ہے امام ابو یوسفؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ فریقین

کے دلائل جو امام سرخسی نے نقل کیے ہیں لائق غور ہیں :-

"مستامن کے لیے اہل حرب سے سُود پر نقد یا قرض معاملہ کرنا یا خمر یا خنزیر اور مردار اُن کے ہاتھ فروخت کرنا ابو حنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے، مگر ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ امام ابو یوسف کا استدلال یہ ہے کہ مسلمان ملتزم احکام اسلام ہے خواہ کہیں ہو، اور اس نوع کے معاملہ کی حرمت اسلام کے احکام میں سے ہے، کیا نہیں دیکھتے کہ حربی مستامن سے ہمارے دار میں ایسا معاملہ کیا جائے تو جائز نہ ہوگا، پس جب یہاں یہ ناجائز ہے تو دارالحرب میں بھی ناجائز ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں مقدم الذکر دونوں امام فرماتے ہیں کہ یہ تو دشمن کے مال کو اس کی مرضی سے لینا ہے، اور اس کی اصل یہ ہے کہ ان کے اموال ہمارے لیے مباح ہیں۔ مستامن نے ذمہ داری صرف اس قدر لی تھی کہ ان سے خیانت نہ کرے گا۔ مگر جب اس نے ان عقود کے ذریعہ سے اس کی رضا کے ساتھ یہ مال لیا تو غدر سے تو یوں بچ گیا، اور حرمت سے اس طرح بچا کہ یہ مال اس نے عقد کے اعتبار سے نہیں بلکہ اباحت کی بنا پر لیا ہے۔ رہا دارالاسلام میں حربی مستامن کا معاملہ تو وہ اس سے مختلف ہے کیوں کہ اس کا مال امان کی وجہ سے معصوم ہو گیا ہے اس لیے اباحت کی بنا پر اس کو نہیں لیا جاسکتا۔" (المبسوط ج ۱۰ ص ۹۵)

امام ابو حنیفہ رحمہ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں کے لیے اہل حرب کے اموال کو لوٹنا اور چھین لینا حلال ہے تو ان کی مرضی سے لینا بدرجۂ اولیٰ حلال ہونا چاہیے مطلب یہ ہے کہ لشکر اسلام کے حدود سے باہر ان کے لیے کوئی امان نہیں ہے، مسلمانوں کے لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لینا جائز ہے۔" (المبسوط ج ۱ ص ۱۳۸)

"امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان چونکہ اہل دارالاسلام میں سے ہے اس لیے وہ حکم اسلام کی بنا پر ہر جگہ ربٰو سے ممنوع ہے۔ اس کے فعل کی یہ توجیہہ درست نہیں کہ وہ کافر کے مال کو بطیب نفس سے لے رہا ہے، بلکہ وہ اس کو دراصل اُس خاص صورت معاملہ کی بنا پر لیتا ہے، کیونکہ اگر وہ خاص صورت معاملہ (یعنی عقد فاسد نہ

ہو تو کافر اس کو کسی دوسری صورت سے اپنا مال دینے پر راضی نہ ہوگا ——— اگر دار الحرب میں ایسا کرنا جائز ہو تو مسلمانوں کے دار الاسلام میں بھی اس طرح کا معاملہ جائز ہوگا کہ ایک شخص ایک درہم کے بدلے دو درہم لے اور دوسرے درہم کو ہبہ کے نام سے موسوم کر دے۔" (المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸)

ہمارا مقصود دونوں اقوال میں محاکمہ کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود امام ابو حنیفہ رح کے مذکورۂ بالا اقوال سے اور ان کے مذہب کے دوسرے مسائل سے جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں چار باتیں صاف طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

اوّلاً یہ معاملہ صرف اس مسلمان کے لیے جائز ہے جو دار الاسلام کی رعایا ہو اور امان لے کر دار الحرب میں جائے۔

ثانیاً یہ معاملہ صرف ان حربی کافروں سے کیا جا سکتا ہے جن کے نفوس و اموال مباح ہیں۔

ثالثاً اس طریقہ سے جو مال لیا جائے گا وہ غنیمت نہ ہوگا۔ اس لیے کہ نہ تو وہ اشرف الجہات سے ہے، نہ اس میں دین کا اعزاز ہے، نہ اس میں خمس ہے، بلکہ وہ مجرد اکتساب مال ہے ——— اسی طرح وہ فئے بھی نہیں ہے کیونکہ فئے حکومت اسلام کی ملک ہوتی ہے اور یہ مال وہ شخص خود لیتا ہے، بیت المال میں داخل نہیں کرتا۔

رابعاً اس طریقہ سے کفار کا مال لینا صرف جواز قانونی کے درجہ میں ہے، بلکہ جواز کی آخری حد پر ہے، اور اس کی قانونی حیثیت صرف اتنی ہے کہ اگر مسلمان ایسا کرے گا تو امام صاحب کی رائے میں دیناً بھی اس کو یہ مال واپس کرنے کا فتویٰ نہ دیا جائے گا، بخلاف مال غدر کے کہ اگرچہ قضاءً اسے واپسی پر مجبور نہ کیا جائے گا مگر دیناً اس کو واپس کر دینے کا حکم دیا جائے گا۔

خامساً مستامن مسلمان جس طرح دار الحرب کے کافروں سے عقود فاسدہ پر معاملہ کر سکتا ہے اسی طرح وہ وہاں کے مسلمان باشندوں سے بھی ایسا کرنے کا مجاز ہے، کیوں کہ ان کے اموال بھی مباح ہیں۔ اس کے حوالے ہم اس سے پہلے درج کر چکے ہیں اور آگے بھی یہ بحث آ رہی ہے۔

۳- دار الکفر اور دار الحرب کی مسلم رعایا

وہ مسلمان جو دار الکفر میں رہیں اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کریں اسلام کی حفاظت سے خارج ہیں۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور حدود حلال و حرام کی پیروی مذہباً ان پر لازم ہے، لیکن اسلام ان کی ذمہ داری سے بری ہے، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے۔ غنیمت اور فے میں ان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں جیسا کہ بصراحت حدیث میں مذکور ہے۔ اور دنیوی حیثیت سے ان کے نفوس اموال غیر معصوم ہیں، کیونکہ عصمت مُقومہ ان کو حاصل نہیں۔

اگر ایسے مسلمان "حربی" قوم سے ہوں تو گویا مباح الدم والاموال ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے قاتل پر قصاص کیا معنی دیت بھی نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں کفارہ تک نہیں۔ اس باب میں فقہاء کے چند اقوال ہم بے کم و کاست نقل کر دیتے ہیں جن سے دار الحرب کی مسلمان رعیت کا قانونی مقام آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

لَا قِیمَۃَ لِدَمِ المُقِیمِ فِی دَارِ الحَرْبِ بَعْدَ اِسلَامِہٖ قَبلَ الهِجْرَۃِ اِلَینَا...... اَجرَوہُ اَصحَابُنَا مَجرَی الحَربِی فِی اِسقَاطِ الضَّمَانِ عَنْ مُتلِفِ مَالِہٖ ...... مَالُہٗ کَمَالِ الحَرْبِی مِنْ ھٰذَا الوَجْہِ وَلِذٰلِکَ اَجَازَ اَبُو حَنِیفَۃَ مُبَایَعَتَہٗ عَلٰی سَبِیلِ مَا یَجُوزُ مُبَایَعَۃُ الحَرْبِی مِن بَیعِ الدِّرھَمِ بِالدِّرھَمَیْنِ فِی دَارِ الحَرْبِ۔

(احکام القرآن للجصاص الحنفی ج ۲ ص ۲۹۷)

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد ہجرت نہ کرے اور دار الحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں ...... ہمارے اصحاب نے اس کو حربی کے درجہ میں قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کے مال کو نقصان پہنچانے والے پر کوئی ضمان نہیں ...... اس کا مال اس لحاظ سے حربی کے مال کی طرح ہے اسی لیے ابو حنیفہؒ نے اس

کے ساتھ بھی خرید و فروخت کی وہ صورت جائز رکھی ہے جو حربی کے ساتھ جائز رکھی ہے، یعنی دارالحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا یعنی سود۔

من فی دار الحرب فی حق من هو فی دار الاسلام کالمیت

(المبسوط ج۱۰ ص۶۴)

جو شخص دارالحرب میں ہے وہ دارالاسلام والے کے لیے گویا مُردہ ہے۔

اِنْ تَتَرَّسُوا باطفالِ المُسلمِین فَلَا بَاس بالرَّمی اِلَیهِم وَاِنْ کَانَ الرَّامِی یَعْلَمُ اَنَّہُ یُصِیْبُ المسلمَ...... وَلَا کَفَّارَۃَ عَلَیہِ وَلَا دِیَۃَ۔ (ایضاً ص۶۵)

اگر اہل حرب مسلمانوں کے بچوں کو ڈھال بنائیں تو ان پر نشانہ لگانے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ نشانہ لگانے والا جانتا ہو کہ مسلمان کو نشانہ بنا رہا ہے ...... اس پر نہ دیت ہے نہ کفارہ۔

وَاِذَا اَسْلَمَ الحربیُّ فی دارِ الحربِ ثم ظَھَرَ المُسلِمُونَ علی تِلْکَ الدارِ تَرَکَ لَہٗ مَا فِی یَدَیہِ مِنْ مالِہٖ و رَقِیقِہٖ وولدِہِ الصغارِ...... فاَمَّا عقارہ فَاِنَّھَا تَصِیرُ غنیمۃً لِلمُسلِمِینَ فی قولِ ابی حنیفۃ ومحمدٍ وَقَالَ اَبُو یُوسُف استحسن فاجعل عقارہٗ لَہٗ۔

(ایضاً ص ۶۶)

اگر حربی دارالحرب میں مسلمان ہو پھر اس دار پر مسلمان فتح پائیں تو اس کا مال اور اس کے غلام اور اس کے نابالغ بچے چھوڑ دیئے جائیں گے ...... مگر اس کی غیر منقولہ جائداد مسلمانوں کے لیے غنیمت قرار دی جائے گی۔ یہ ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کا قول ہے۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ میں احسان کے طور پر غیر منقولہ جائداد بھی اس کے پاس رہنے دوں گا۔

واكره للرجل ان يطأ امته او امرته فى دار الحرب مخافة ان يكون له فيها نسل لانه ممنوع من التوطن فى دار الحرب........ واذا خرج ربما يبقى له نسل فيتخلق ولده باخلاق المشركين۔ (ایضاً ص ۵۸)

امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص کے لیے اس کو بھی مکروہ سمجھتا ہوں کہ وہ دارالحرب میں اپنی لونڈی یا بیوی سے مباشرت کرے، خوف ہے کہ کہیں وہاں اس کی نسل نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب کو وطن بنانا ممنوع ہے......... اور اس لیے کہ اگر وہ وہاں سے نکل آیا اور اپنی نسل وہاں چھوڑ آیا تو اس کی اولاد مشرکین کے اخلاق اختیار کرے گی۔

آخری بات جو اس سلسلہ میں ڈرتے ڈرتے ہم بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ امام اعظم کی رائے میں دارالحرب کے مسلمان باشندوں کے لیے ایک دوسرے سے سُود کھانا مکروہ ہے، لیکن اگر وہ ایسا معاملہ کریں تو اس کو رد نہ کیا جائے گا۔ اس رائے سے امام محمد رح نے بھی اختلاف کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ان دونوں مسلمانوں کا مال معصوم عن التملك بالاخذ[1] ہے، جب مسلمان اس ملک پر فتح پانے کی صورت میں ان کے مال کو غنیمت قرار نہیں دے سکتے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا مال غنیمت کے طور پر لینے کا کیا حق ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رح نے اپنی رائے کی تائید میں جو قانونی استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قانونی حیثیات کے پیچیدہ اور نازک فروق کو سمجھنے میں امام صاحب کا تفقہ کس قدر بڑھا ہوا تھا۔ ہم اس بیان کو لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں کیوں کہ اس سے اصول قانون کے ایک اہم مسئلہ

---

[1] یعنی ایک مسلمان کا مال دوسرے مسلمان کی ملک محض [illegible] بنا پر نہیں بن سکتا کہ وہ اس نے کسی نہ کسی طور پر اس سے لے لیا ہے۔

پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

بالاسلام قبل الاحراز تثبت العصمة فی حق الامام دون احکام الآخرة ان احدھما لو اتلف مال صاحبه او نفسه لم یضمن وھو اثم فی ذالک وانما تثبت العصمة فی حق الاحکام بالاحراز والاحراز بالدار لا بالدین لان الدین مانع لمن یعتقده حقا للشرع دون من لا یعتقده وبقوۃ الدار یمنع عن ماله من یعتقد حرمته ومن لم یعتقده وبثبوت العصمة فی حق الاثم قلنا یکرہ لھما ھذا الصنیع ولعدم العصمة فی حق الحکم قلنا لا یومران برد ما اخذہ لان کل واحد منھما انما یملک مال صاحبه بالاخذ

(المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸)

دار الاسلام کی حفاظت میں آنے سے پہلے محض اسلام سے جو عصمت ثابت ہوتی ہے وہ صرف امام کے حق میں ہے مگر احکام میں نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو اگر ان دونوں مسلمانوں میں سے ایک شخص دوسرے کا مال یا جان تلف کر دے تو اس پر ضمان نہ ہو گا حالانکہ وہ ایسا کرنے میں گناہ گار ہو گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ احکام میں عصمت صرف حدود دار الاسلام کے اندر ہونے سے ثابت ہوتی ہے اور یہ حفاظت دار کے سبب سے ہے نہ کہ دین کے سبب سے۔ دین تو حق شرع کے لحاظ سے صرف ان لوگوں کو روکتا ہے جو اس پر اعتقاد رکھتے ہوں اور ان کو نہیں روکتا جو اسے نہ مانتے ہوں۔ بخلاف اس کے دار کی قوت سے آدمی کے مال کی حفاظت اس کے مقابلہ میں بھی کی جاتی ہے جو اس کی حرمت کا اعتقاد رکھتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں بھی جو ایسا اعتقاد

نہیں رکھتا۔ پس گناہ ہونے کی حیثیت سے جو عصمت ثابت ہے، اس کی بنا پر ہم نے کہا کہ ان کے لیے یہ فعل مکروہ ہے اور قانون کے لحاظ سے عدم عصمت کی بنا پر ہم نے یہ کہا کہ ان کے لیے یہ فعل مکروہ ہے اور قانون کے لحاظ سے عدم عصمت کی بنا پر ہم نے یہ کہا کہ ان کا لیا ہوا مال واپس کرنے کا حکم نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مال جب لیتا ہے تو محض لے لینے ہی کی وجہ سے اس کا مالک ہو جاتا ہے۔

یہاں امام صاحب نے اسلامی قانون کے تینوں شعبوں کی طرف اشارات کر دیئے ہیں۔ اعتقادی قانون کے لحاظ سے مسلمان کا مال بلا لحاظ اس کے کہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالکفر میں یا دارالحرب میں بہر حال معصوم ہے اور اس عصمت کا مآل یہ ہے کہ اس کی بنا پر خدا کے مقرر کیے ہوئے طریق کے خلاف لینے والا گناہ گار ہوگا۔ دستوری قانون کے لحاظ سے دارالاسلام میں رہنے والے کافر کے مال کو جو عصمت حاصل ہے وہ دارالکفر میں رہنے والے مسلمان کو حاصل نہیں اس لیے اگر دارالکفر کا کوئی دوسرا مسلمان اس کو حرام طریقہ سے لے لے تو خدا کے ہاں گناہ گار ہوگا مگر دنیا میں اس پر اسلامی حکم جاری نہ ہوگا۔ تعلقاتِ خارجیہ کے قانون کی نگاہ میں کفار کے درمیان رہنے والا مسلمان اپنے تمدنی حقوق اور واجبات کے لحاظ سے انہی کافروں کا شریک حال ہے اس لیے وہ بھی اسی طرح نفسِ اخذ سے مال کا مالک ہوتا ہے۔ جس طرح خود کفار مالک ہوتے ہیں۔ پس اگر اس بنیاد پر دارالکفر میں مسلمان مسلمان سے سود کھائیں یا مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے سود کھائیں تو وہ ان اموال کے مالک تو ہو جائیں گے اور ان کو واپس کرنے کا حکم بھی نہ دیا جائے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سود کھانے اور کھلانے والے مسلمان گناہ گار نہ ہوں گے۔

قولِ فیصل

یہاں تک ہم نے قانونِ اسلامی کی جو تفصیلات درج کی ہیں ان سے جناب مولانا مناظر احسن صاحب کے استدلال کی پوری بنیاد منہدم ہو جاتی ہے۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ:۔

(۱) تمام غیر ذمّی کافر مباح الدم والاموال نہیں ہیں، بلکہ اباحت صرف ان کافروں کے خون اور مال کی ہے جو برسرِ جنگ ہوں۔ لہٰذا اگر سود لینا اور عقودِ فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز ہے تو صرف برسرِ جنگ کافروں کے ساتھ ہے۔ اور ایسا کرنے کا حق صرف اُن مسلمانوں کو پہنچتا ہے جو دارالاسلام کی رعیت ہوں، جن کے سرداروں نے کسی دارالکفر کو دارالحرب قرار دیا ہو، اور جو دارالحرب میں امان لے کر تجارت وغیرہ اغراض کے لیے داخل ہوئے ہوں۔

(۲) دارالکفر اول تو ہر حال میں دارالحرب نہیں ہوتا، اور اگر اعتقادی کے لحاظ سے وہ دارالحرب سمجھا جائے تو اس کے مدارج مختلف ہیں اور ہر درجہ کے احکام الگ الگ ہیں۔ ایک ہی معنی میں تمام غیر اسلامی مقبوضات کو دارالحرب سمجھنا، اور ان میں علی الدوام وہ احکام جاری کرنا جو خاص حالتِ جنگ کے لیے ہیں، قانونِ اسلامی کی اسپرٹ ہی کے نہیں بلکہ صریح ہدایات کے بھی خلاف ہے اور اس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ اباحتِ نفوس و اموال کی بنا پر جو جزئیات متفرع ہوتے ہیں، وہ صرف اُسی زمانہ تک نافذ رہ سکتے ہیں جب تک کسی دارالکفر کے ساتھ حالتِ جنگ قائم رہے۔ پھر ان تمام احکام کا تعلق خود دارالحرب کی مسلمان رعایا سے نہیں ہے بلکہ اُس دارالاسلام کی رعایا سے ہے جو اس دارالحرب کے ساتھ برسرِ جنگ ہو۔

(۳) ہندوستان[۱] عام معنی میں اس وقت سے دارالکفر ہو گیا ہے جب سے

---

[۱] قبل تقسیم کے ہندوستان کا ذکر ہے۔

مسلم حکومت کا یہاں استیصال ہوا۔ جس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جواز سود کا فتویٰ دیا تھا، اس زمانہ میں واقعی یہ مسلمان ہند کے لیے دارالحرب تھا اس لیے کہ انگریزی قوم مسلمانوں کی حکومت کو مٹانے کے لیے جنگ کر رہی تھی جب اس کا استیلاء مکمل ہو گیا اور مسلمانانِ ہند نے اس کی غلامی قبول کر لی تو یہ ان کے لیے دارالحرب نہیں رہا۔ ایک وقت میں یہ افغانستان کے مسلمانوں کے دارالحرب تھا۔ ایک زمانہ میں ترکوں کے لیے دارالحرب ہوا۔ مگر اب یہ تمام مسلمان حکومتوں کے لیے دارالصلح ہے۔ لہٰذا مسلمان حکومتوں کی رعایا میں سے کوئی شخص یہاں سود کھانے اور عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ سرحد کے بعض آزاد قبائل اس کو اپنے لیے دارالحرب سمجھ سکتے ہیں اور اگر وہ یہاں عقود فاسدہ پر معاملات کریں تو حنفی قانون کی رُو سے ان کے فعل کو جائز کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ جواز محض قانونی جواز ہے۔ خدا کی نظر میں وہ مسلمان ہرگز مقبول نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہو اور پھر سود خواری سے، مے فروشی سے، قمار بازی سے سور کے گوشت اور مردار چیزوں کی تجارت سے اسلام کو غیر قوموں کے سامنے خوار بھی کرتا پھرے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے قرض دار بھائی کو گرفتار کرائے اور سول جیل بھجوا دے، درآں حالیکہ اسے معلوم ہو کہ اس کے قبضہ میں درحقیقت کچھ نہیں ہے اور اس کے بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرض خواہ کو ایسا کرنے کا حق ہے، اور جو کچھ وہ کر رہا ہے قانونی جواز کی حد میں کر رہا ہے۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ قانونی جواز کی حد میں کر رہا ہے۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ قانونی جواز کی بالکل آخری سرحد ہے، اور جو انسان قانون کی آخری سرحدوں پر رہتا ہے وہ بسا اوقات جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

(۴) ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جس کے لیے فقہی زبان میں "متامن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ متامن کے لیے پہلی شرط دارالاسلام

کی رعایا ہوتا ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ دارالحرب میں اس کا قیام ایک قلیل مدت کے لیے ہو۔ حنفی قانون میں حربی مستامن کے لیے دارالاسلام کے اندر رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون تبدیل جنسیت (Law of Naturalisation) کی رُو سے اس کو ذمّی بنا لیتا ہے۔ اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان مستامن کے لیے دارالحرب میں قیام کرنے کی مدت سال دو سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اسلامی شریعت جو مسلمانوں کو دارالاسلام میں سمیٹنے اور کافروں کو ذمّی بنانے کے لیے سب سے زیادہ حریص ہے، کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص دارالحرب کو اپنا وطن بنا لے اور وہاں نسلوں پر نسلیں پیدا کرتا رہے اور اس حیثیت میں زندگی بسر کرتا چلا جائے جو مستامن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ پھر جب یہ ایک شخص کے حق میں جائز نہیں، تو کروڑوں مسلمانوں کی عظیم الشان آبادی کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ قرنوں تک ''مستامن'' کی سی زندگی بسر کرے اور ایک طرف ان اباحتوں سے فائدہ اٹھاتی رہے جو حالت ''استیمان'' کے لیے عارضی طور پر منتشر افراد کو محض جنگی ضروریات کے لیے دی گئی تھیں، اور دوسری طرف وہ تمام قیود اپنے اُوپر عاید کر لے جو مستامن کو عارضی طور پر اسلامی قانون کی پابندی سے آزاد کر کے کفار کے قوانین کا پابند بناتی ہیں۔

(۵) مسلمانانِ ہند کی صحیح قانونی پوزیشن یہ ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جن پر کفار مستولی ہو گئے ہیں۔ ان کا دار جو کبھی دارالاسلام تھا، اب دارالکفر بن گیا ہے، مگر دارالاسلام کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں ——— ان کا فرض یہ ہے کہ تو کسی دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں، یا اگر اس پر قادر نہیں ہیں تو اس ملک میں جو اسلامی آثار باقی ہیں ان کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور جتنی تدابیر ممکن ہوں وہ سب اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے میں صرف کرتے رہیں۔ احکام کفر کے تحت جو زندگی وہ بسر کر رہے ہیں۔ اس کا ہر سانس ایک گناہ ہے ——— اب کیا باقی ماندہ آثار اسلامی کو

بھی منشا کہ اس گناہ میں مزید اضافہ کرنا منظور ہے ؟

(ترجمان القرآن رمضان ۱۳۵۵ھ / دسمبر ۱۹۳۶ء ، ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ / فروری ۱۹۳۷ء)